Editor

Mohinder

H. S. R

★

Price

-/6/-

امید، حرکت اور روشنی کا پیامبر

جلد ۱ دسمبر ۱۹۵۳ء شمارہ ۳

ماہنامہ

پگڈنڈی

امرتسر

ادارہ
مہندر باوا
ایچ ایس رہبر

فی کاپی
چھ (۶) آنے

چار روپے آٹھ آنے

[illegible] ایس [illegible] پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے [illegible] آرٹ پریس امرتسر سے چھپوا کر [illegible] شائع

جھلکیاں

حرفِ اوّل

ادب میں جمود ہے یا نہیں؟ اس وقت ہم اس بحث میں الجھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں ادب فہم حضرات بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور کہہ رہے ہیں

ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ ادب چونکہ زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور زندگی ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے اس لئے ادب میں انجماد یا انحطاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بادی النظر میں جمود کا جو کہرا جادے ادب پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ ادباء اور شعراء کی نگارشات کی اشاعت کے لئے معیاری جرائد کا فقدان ہے۔ پگڈنڈی کے اجراء نے اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا ہے۔ اس کی ایک جھلک " اور فنکاروں نے کہا " کے عنوان کے تحت چھپنے والے پیغامات سے مل سکتی ہے۔ پگڈنڈی کی روز افزوں مقبولیت اور اس کی بڑھتی ہوئی اشاعت کے پیش نظر پگڈنڈی کا یہ شمارہ منظر عام پر لاتے ہوئے ہم اپنے ادب نواز ساتھیوں کے پُرخلوص تعاون پر بجا طور پر فخر محسوس کر رہے ہیں۔

ادارہ

[illegible]

کشمیری لال ذاکر

گھاٹ

وہ شہر سے بہت دور نکل آیا تھا — دریا کے کنارے چلتے چلتے یہ سوچ رہا تھا کہ کتنا فاصلہ ہو گیا ہے۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ میں وہ ایک سکون محسوس کر رہا تھا۔ اس دھوپ میں جلن نہیں تھی۔ ایک سکون تھا۔ ایک آرام وہ چاہتا تھا جیسے پورنما کی چاندنی اور اس کا دماغ خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا — خیالوں کے جال بھی تو سکون دہندہ ہی بن سکتے ہیں۔ اضطراب کے تو خفیف سے جھٹکے بھی نازک تاروں کو توڑ دیتے ہیں — سکون دھرتی کا راگ ہے جو کسی پہاڑی جھرنے کی طرح ایک ہی لے سے مستی بکھیرے جاتا ہے۔ اور اضطراب ایک سلگتی ہوئی آگ جس کا دھواں آہستہ آہستہ خیالات کا گلا گھونٹ دیتا ہے — دریا کے بہاؤ کے خلاف چلتے ہوئے وہ چھوٹی چھوٹی لہروں کو ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتی تھیں، کھیلتی تھیں۔ رقص کرتی تھیں، کچھ گنگناتی تھیں — لہریں کون سے نغمے گایا کرتی ہیں؟ کون ان نغموں کی تخلیق کرتا ہے اور پھر ان لطیف نغموں کو سمجھتا کون ہے؟ کیا یہ سب انسان کے لئے ہے — شکستوں، ناامیدیوں اور مایوسیوں کی آگ میں جلتا ہوا انسان کا ایک پنجر — اس کا جی بہلانے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں۔ یہ لہریں، یہ تارے، یہ پھول — اور کیا وہ ان کو سمجھ سکے — لہریں اسی طرح اپنے کھیل میں مصروف تھیں۔ ان کے کھیل دریا کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال رہے تھے۔ جس طرح انسان کے کھیل زندگی کے بہاؤ میں روڑے اٹکایا کرتے ہیں — انسان کے کھیل دراصل زندگی کے دریا کے بہاؤ کو باندھنے کی ناکام کوششوں کے نام ہیں — ہر کھیل دریا کو کسی خاص سمت چلانے کی کوشش ہی ہے — انسان کے ہر کھیل میں ہی خود غرضی کا عنصر شامل ہے یہ کھیل بے چارگی [illegible] لیکن لہروں کے کھیل [illegible] اور انجام [illegible] ہیں — [illegible] میں [illegible] ہوئی لہروں کے کھیل اس کے [illegible] جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے — سنگ تراش میں الجھا ذہن تو

تھا۔ اور وہ بہاؤ دریا کی روانی کی تخلیق بھی۔ لیکن اس کے الجھے ہوئے خیالات کو سلجھانے کی ہمت کسی میں بھی نہ تھی — اس کی زندگی کا دور یادداں مزید تھا۔ لیکن اس سے ہر ایک سمجھ کی کیاں [illegible] اور الجھی تھیں — اور وہ اپنی زندگی کے دریا میں لہروں کے اٹھتے اور بجھتے ہوئے خاکے دیکھ رہا تھا۔

لہروں کے خیال میں منہمک وہ کنارے پر کھڑا ہو گیا — کنارے کے قریب شاید پانی کم گہرا تھا۔ اس لئے چھوٹی چھوٹی لہروں کا رقص وہاں دکھائی نہ دیا — وہ کنارے کے اور قریب ہو گیا — تب معلوم ہوا کہ وہ پرانے گھاٹ پر کھڑا ہے۔ چند سال ادھر اس سے ذرا اوپر نیا گھاٹ بن گیا تھا اور اب اس گھاٹ پر کوئی نہ آتا تھا — نہ جانے کتنی مدت یہ گھاٹ آباد رہا — اب تو سیڑھیوں کے بہت سے پتھر ٹکڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ دراڑوں میں گھاس اگ آئی تھی — چونا بارش کی وجہ سے بہہ گیا تھا — اب وہ گھاٹ ایک ایسی لاش کی طرح تھا جس سے لوگ خوف کھاتے ہیں۔ نزدیک نہیں آتے۔ اس گھاٹ کا ہر پتھر نہ معلوم کتنے افسانے سنا سکتا تھا — ان پتھروں سے نہ جانے کس کس وقتوں کے لوگوں کے پاؤں مس ہوئے تھے — کون کہہ سکتا ہے پتھر کے دل بھی دھڑکے ہوں — ان اکھڑے ہوئے اور دریا میں گرے ہوئے پتھروں نے کس کس پائل کی جھنکار سنی ہو گی — جذبات کے کھیلوں کے کتنے ہی نشان ان کی ٹھوس سطح پر اب بھی دیکھے جا سکتے ہوں گے — دریا کا گھاٹ ایک مکمل تاریخ ہے — مگر یہ انسان ان اوراق کو الٹنے کے قابل نہیں — اور اب یہ پتھر اپنے راز سینوں میں سنبھالے وقت کی ٹھوکروں کا مقابلہ کر رہے تھے اب تو کوئی کشتی یہاں نہیں لگتی۔ کبھی بھی افسانے کی ابتدا یہاں نہیں ہوتی — اب تو لہریں بھی اس کے پاس ٹھہرنا نہیں چاہتیں وہ گھاٹ گویا کسی دکھیا [illegible] خیالات کا [illegible] ہے۔ جس نے اپنے گرد ماضی کا [illegible] لپیٹ رکھا ہے اور دریا کی ننھی ننھی لہریں جلد

یاں وہ من کے کھیل ... کی رہتی ہیں — اور وہ الھڑ
لڑکیاں اس پہ بیٹھ کی کرنیں اداس دستری آنکھوں سے وہ رقص
دیکھتی ہیں — گاتی ہیں، ہنستی ہیں اور وہ بوڑھا کچھ نہ دیکھتے ہوئے بھی
محسوس کر رہا ہے — اُس کے اپنے خیالات کی لہروں میں
ہی الجھا رہ گیا۔ دریا کی روانی کچھ رکتی ہوئی سی معلوم ہوئی
اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود بھی ایک گھاٹ ہے —
کنارے زندگی کے کنارے بنایا گیا خوبصورت گھاٹ۔ کبھی وہاں
بھی ننھی ننھی کشتیاں لہروں سے کھیل کر فارغ ہو جانے کے بعد سستانے
آ لگتی تھیں۔ اُس نے بھی حباب جمنوں کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں بھی حسن و
عشق کے افسانوں کی ابتدا ہوئی تھی — مگر اب دریا نے رُخ بدل
لیا ہے۔ اب اُس گھاٹ کی ضرورت نہیں — اب وہاں کوئی بھی
نہیں آتا۔ اب وہ تھکے ہوئے مسافر کی طرح کنارے پر پڑا دریا کے
بہاؤ کو حسرت نگاہوں سے تکتا رہتا ہے۔ اب وہ گھاٹ ٹوٹ گیا ہے
اور اسے پرانے گھاٹ کے اُکھڑے ہوئے پتھروں سے کچھ مناسبت
سی محسوس ہوئی۔ اُس نے چاہا، وہ ان پتھروں سے لپٹ کر خوب
روئے۔

دور افق پر سورج کی خوشنما کشتی بھی اپنے نہ جانے کب سے بنے ہوئے
ہوئے ایک ہی گھاٹ پر لگنے کی کوشش میں تھی — یہ گھاٹ کیا
کبھی پرانا نہ ہوگا۔ اس پر کیا ہمیشہ دولت، جھل مل، ننھے اور رقص
ہی نظر آئیں گے۔ یہاں ہمیشہ ہولی ہی کھیلی جائے گی۔ اس گھاٹ
کے پتھر کبھی نہ اُکھڑیں گے۔ اور کیا اس گھاٹ کا دریا کبھی اپنا رُخ
نہ بدلے گا — اب تو اسے رُخ بدل دینا چاہیے۔ وہ کچھ یونہی
سی باتیں کر رہا تھا۔ اُس کی گفتگو کا مخاطب شاید وہی پرانا گھاٹ
تھا جس میں اسے بہت کچھ مطابقت دکھائی دیتی تھی — اور
اُس نے ذرا اوپر نئے گھاٹ پر لگی ہوئی خوبصورت چھوٹی چھوٹی کشتیوں
کی قطار دیکھی جو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں کسی دور کے
دیس کی جل پریاں معلوم ہوتی تھیں — اس نے بھی بہت سی جل
پریوں کے کھیل دیکھے تھے۔ اور پرانا گھاٹ ایک دفعہ پھر زندہ
ہونے لگا۔ اس کے خیالات نے ایک دفعہ پھر انگڑائی لی —
دیپالی، زہرہ، ثریا، نسیم، بلقیس جانے کتنی ہی جل پریاں وقت
کے گہرے نیلے پردے سے جھانکنے لگیں۔ وہ پھر اُن کے رقص کو

نغموں میں کھو گیا — کئی چاندنی راتیں — پھولوں سے بھرے
ہوئے کئی باغ — آبِ حیات اگلتے ہوئے کئی چشمے — کنول
پھولوں سے بھری ہوئی کئی جھیلیں — سانپ کی کنڈلی میں سوئے
ہوئے کئی دریا — اور سیماب کی طرح مچلتے ہوئے کئی آبشار اُس
کے تصور کی دنیا آباد کرنے آ گئے — اس نے ہر افسانے کو خود
پڑھنا شروع کیا — دیر تک وہ اُن کہانیوں میں مصروف رہا
— آخر دنیا کی ہر شے کی طرح ناؤں کے وہ افسانے بھی ختم ہو
گئے۔ جل پریاں جیسے دریا کی تہہ میں غوطہ لگا گئی تھیں — نئے گھاٹ کے
ساتھ لگی ہوئی کشتیاں تاریکی کے لبادے غلاف میں چھپ گئی تھیں
اور پرانا گھاٹ عابد کے پاگل پن پر جیسے قہقہے لگا رہا تھا۔ پاؤں کو
ہلاتے وقت ایک پتھر لڑھک کر دریا کے پانی میں جا گرا تھا، یہی
تھا اس بوڑھے گھاٹ کا کھوکھلا سا قہقہہ —

عابد کی عمر چالیس سے کچھ اوپر تھی اور ابھی تک وہ شادی نہ
کر سکا تھا۔ اُس کا گھر ابھی تک آباد نہ ہو سکا تھا۔ وہ رات کے دو
بجے گھر پہنچے یا سرِ شام ہی چراغ گل کر کے چارپائی پر پڑا رہے۔ کوئی
پوچھنے والا نہ تھا۔ وہ پیٹ بھر کر کھائے یا بالکل بھوکا رہے۔ اُس
کے کانوں میں مسرت کے گیت پڑیں یا وہ نوحہ غم اٹھائے۔ وہ پھولوں
کی سیج پر سوئے یا انگاروں سے کھیلے۔ اُس کے لبوں پر تبسم رقص کرے
یا آنکھوں میں اشکوں کی دھند بھر جائے — کسی کو اس سے کیا غرض
وہ بے سہارا تھا بالکل بے سہارا — اُس پرانے گھاٹ کی طرح
جسے دھوپ سے بچنے کے لیے کسی درخت کی چھاؤں بھی میسر نہ تھی
آج اسے پہلی دفعہ اپنے اکیلے پن کا اتنی شدت سے احساس ہوا کہ
اُس کی آنکھیں دور افق کے قریب ستارے کو جھلکتے ہوئے دیکھنے
لگیں — اس نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کیا۔ اس نے صرف
اپنی انفرادی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے شادی نہیں کی۔ اس
نے زندگی میں ایک کا ہو کر رہنا نہیں سیکھا۔ وہ ہمیشہ دور کی چیزوں
کے پیچھے بھاگا۔ اپنی چیزوں کی اس نے کبھی قدر نہ کی۔ ٹھکرا دیا۔ توڑا
اور پھینک دیا — اور آج وہ ان ٹوٹی ہوئی پھینکی ہوئی اور
ٹھکرائی ہوئی چیزوں کے ٹکڑوں سے بھی محروم تھا۔ اسی گھاٹ کی
طرح جس پر وہ بیٹھا تھا — اس نے آج کے گھاٹ کی طرح
صرف ایک ہی کشتی کو نہیں اپنایا — اس نے ہر کشتی کو اپنے قریب

سے قریب [illegible] کوئی کمی تھی نہیں
سکھی [illegible] ——— اور [illegible]
گیا [illegible]
اس کی [illegible] کچھ ڈھونڈ رہی تھیں
——— اور جیسے [illegible] آ گئی ——— تاریکی کے
پردے پر ایک تصویر آہستہ آہستہ ابھرنے لگی ——— نجمہ اُس
کی ایک دور کی رشتہ دار۔ ایک آدھ بار جیسے اُس کے
سامنے کھڑی ہو گئی ——— اسے اپنے تنہائی کے بوجھ کو اٹھا کر گرا
دینے والی ہستی نظر آ گئی ——— اور وہ سوچنے لگا۔ اُن چھوٹی چھوٹی
معمولی باتوں کو جن پر اُس نے کبھی دھیان نہ دیا تھا لیکن جو ایک
معصوم دل کے جذبات کے عکس تھے ——— عکس ہمیشہ مدھم ہوتا
ہے ——— ابھی چند ماہ پہلے وہ ایک شادی کے سلسلے میں نجمہ کے
ہاں گیا تھا ——— کیسے لطف سے دن کٹے تھے وہاں ——— سو کر اٹھنے
سے پہلے اسے نجمہ نظر آتی۔ اُس کا منہ ہاتھ دھلاتی ۔ ناشتہ کراتی اور
پھر دوپہر کو کوئی اچھی سی کتاب پڑھ کر سناتی ——— اُس کی آنکھیں
زبان سے زیادہ باتیں کر سکتی تھیں۔ اُن آنکھوں میں ایک سکون
تھا جھیل کے ساکن گہرے پانی کی طرح ——— اُن میں چھلپا نہیں
تھی ——— وہ دور کی چیزوں کے پیچھے بھاگنے کی حسرت سے بے نیاز
تھیں ——— وہ زمین کی طرح ایک ہی مرکز کے گرد گھوم سکتی تھیں
ایک ہی محور کے گرد گھومنے میں ہی تو زمین کی زندگی کا راز ہے ۔
کاش وہ بھی ایک ہی محیط پر چکر کاٹ سکتا ——— لیکن اُس کی عمر
تو بیس سال سے بھی شاید کچھ کم تھی اور پھر چالیس سال کے ایک
نیم بوڑھے انسان سے اتنا لگاؤ اور پیار کیوں ؟ ———
وہ شاید عابد کی تجرد اور بے سہارا زندگی پر ترس کھاتی تھی ———
وہ پیار شاید رحم کی کچھ بدلی سی حالت ہو ——— اگر رحم کے رنگ
میں ہی کسی کا پیار پایا جائے تو کیا برا ہے ؟ آخر وہ عورت کی
[illegible] ہے۔ جگنو کی روشنی کی طرح کبھی کبھی کی چمک نہیں ۔ بلکہ
سورج کی ابدی اور ازلی [illegible] ——— اور عابد کو محسوس ہوا کہ پیاس
کی [illegible] جو اُس کی حیات کو گھیرے ہوئے ہے ۔ [illegible] ہو جائے گی
[illegible] چند دن پہلے کا واقعہ اُس کے دماغ میں گھوم
گیا [illegible] ایک معمولی زمیندار سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا

——— کیوں ؟ اُس کا جواب [illegible]
وقت [illegible]
کی [illegible]
عمل کو چند گھنٹے سے پیار نہیں کیا جا سکتا [illegible]
تھا کہ [illegible]
گھنٹہ دن میں ہی پناہ ملتی ہے ——— ایک [illegible]
پرشین پرانے گھاٹ پر ہے ——— زندگی کے [illegible] میں ہارا ہوا
انسان شہر کے شور و شغب سے ذہنی [illegible]
سے پیار کرتا ہے ——— جیسے اُس وقت اُس نے ایک وقتی جذبہ کہہ کر
ٹال دیا تھا۔ اب وہ اسے اپنی زندگی کا سہارا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس
کے دماغ میں رحم اور محبت کے درمیان کشمکش جاری تھی ———
لیکن رحم اور ہمدردی کبھی کبھی محبت سے زیادہ قربانی دیتے ہیں
عابد تڑپ اٹھا ——— اُسے اپنے اکیلے پن سے بے حد نفرت تھی۔
——— اُس نے اچھی طرح سے اپنا نفسیاتی تجزیہ کر لیا تھا ۔ وہ
اپنے متعلق وثوق سے سب کچھ کہہ سکتا تھا۔ لیکن نجمہ کے متعلق
——— ہر دوسرا انسان ایک اُلجھا ہوا راز ہے۔ کسی کے متعلق
کچھ بھی تو نہیں کہا جا سکتا ——— جسے تم نغمے سمجھتے ہو۔ گیتوں کے
سلیقے سے تم تک آنے کی ایک صورت ہو۔ جسے تم آنسو سمجھتے ہو
شاید وہ شدتِ مسرت سے ڈھلکے ہوئے چند قطرے ہوں جسے
تم ہمدردی خیال کرتے ہو شاید وہ کسی جلے دل کی تپش ہو ———
جسے تم احسان سمجھتے ہو کوئی دوسرا اسے شاید اپنی ایک اشد
ضرورت کی تکمیل سمجھتا ہو ——— وہ نجمہ کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا
تھا ——— اور اب وہ بڑے سے بڑا احسان اٹھانے کو بھی تیار
تھا ——— میٹھے چشموں کے قریب سے آنکھیں بند کر کے
گزر جانے والا عابد اب ایک [illegible] کر سکتا تھا
گلشن کے تازہ پھولوں سے ہمیشہ کترا کر نکل جانے والا انسان
اب ایک ٹوٹے ہوئے غنچے کو بھی مانگنے کے لئے تیار تھا ———
اور اُس کی آنکھوں کے سامنے نجمہ کا زرد چہرہ آ گیا ۔ جس پر
درد اور [illegible] کے گہرے نشان تھے۔ لیکن اُس کی ساکن
خاموش اور [illegible] ہوئی آنکھیں [illegible]
[illegible] کے قریب [illegible] ——— جواب [illegible]

[illegible] ہوں مجھے اپنا کر بخشنے کی زبردست خواہش
[illegible] بچے کے کہے ہوئے الفاظ اُس نے دہرائے
[illegible] اُس زنجیر کی ایک کڑی معلوم ہوئی جو اس کو فاتحانہ
[illegible] کی طرف کھینچے لے جا رہی تھی —— اُس نے فیصلہ کیا ۔ کہ
اگلی صبح ہی اِس شہر کو چھوڑ دے گا —— تاریکی کے پردے
پر دیر پیچھے اُبھری ہوئی تصویر بہت قریب آگئی تھی ——

نے گھاٹ سے کھلی ہوئی کشتیوں میں سے ایک کشتی کھول کر چپو لے
دریا کی لہروں کے جال سے اُٹھی اور اچانک پرانے گھاٹ کی سیڑھیوں
سے آٹکرائی —— وہ چونک پڑا ۔ اُسے اپنے جسم میں ایک
جھٹکے سے ارتعاش کا احساس ہوا —— اُس نے دُور اُچٹتے
سے اُفق کی طرف دیکھا —— شکر تارے کے علاوہ آسمان میں
چاند کا کچھ حصہ بھی روشن تھا۔

میں ظلم ہوتا ہوا دیکھ سکتی تھی، اندر ہی اندر لہو کے گھونٹ پی سکتی تھی، لیکن آواز نہیں نکال سکتی تھی، ڈٹ کر مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، آن سب کے احکام کی تعمیل کر کے اپنے پتی کو پرمیشور سمجھ کے، میں نے کیا سکھ حاصل کیا ہے؟ آخر والدین نے یہی کہہ کے تسلی دینے کی کوشش کی تھی ۔۔۔۔ "بچی ، ہم نے تو اپنی طرف سے اچھا ہی کیا تھا ۔ لیکن تمہاری قسمت" ۔۔۔ لیکن تمہاری قسمت ۔ تمہارے نصیب ۔۔۔۔ کسی کی زندگی برباد کر کے اس کو تشفی دینے کے لئے کتنا جادو بھرا ہے اس لفظ میں ، اب اس لفظ سے دکھوں پر ، میری مصیبت پر کسی کی بھی مصیبت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ، اب میں اپنی ماں ، اپنا چچا ، اپنا بھائی ، اپنا سب کچھ آپ بنوں گی ، ظلم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکوں گی ۔ بے انصافی نہیں سہوں گی ، اندر ہی اندر جل بھن کر اپنا آپ برباد نہیں کرونگی ، ہر جگہ احتجاج کروں گی ، ڈٹ کر مقابلہ کرونگی کسی 'پرمیشور' کی تپنی نہیں بنوں گی ۔ اب میں قسمت کے لفظ کے معنی ہی بدل دوں گی ، شیلا کو ہی دیکھو ، اس نے گھر والوں کی پسند والی جگہ ہی شادی کروائی تھی ، اس نے کافی انکساری سے کام لیا تھا لیکن اس کے پتی کے سبھاؤ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا ۔ آخر اس نے اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کا جتن کیا اور کامیاب ہو گئی لیکن میں اپنی لڑکی کی وساطت سے کھڑی ہونگی ، میری لڑکی ۔۔۔ وہ میری جواں سال طاقت ، میرے ہارے ہوئے جنگ کو جیتے گی ، ابلا سماج کے سبھی ہارے ہوئے جنگوں کو جیتے گی ، مرد ، عورتوں کو لوٹ کے بارے میں پہلی قائم کردہ قیمتوں اور قدروں کے پیمانے سے نہیں ناپ سکیگا ۔ عورتوں کو پاؤں کی جوتی اور گھر کی زینت ہی نہیں کہہ سکے گا !

اب پیٹ کے اس حصے پر جمے ہوئے ہاتھ نے ایک دل کی دھڑکن کی جگہ اک کرب ، ایک درد کے گولے کو محسوس کیا ۔۔۔ اور دس بارہ روز پہلے کی ایک رات کاشو کی آنکھوں میں پھر گئی ۔ جبکہ آدھی رات کے وقت 'پتی پرمیشور' باہر سے جھومتے جھامتے آئے تھے ۔ پان اور الائچیوں سے بھی کسی محفل میں گذارے ہوئے لمحوں کی بو نہیں چھپ سکی تھی ۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے پتی کی خواہش کو نہیں ٹال سکی تھی ،

اب درد شدت اختیار کر گیا تھا ، کاشو کا جسم اٹھا اور زرد ہوتا جا رہا تھا ۔۔۔ درد کا گولا یوں محسوس ہوتا تھا پھٹ کر ہی رہے گا ۔ وہ آہستہ سے بستر سے نیچے اتری ۔ نظر پھر ایکبار افق کی طرف سے پرے تک پھیل گئی ۔ دھند اب کافی حد تک صاف ہو چکی تھی ، پنچھی اسی طرح بے روک اور آزاد اڑ رہے تھے ، ہوا میں سردی سے زیادہ حرارت تھی ، لیکن کاشو کو اس میں سوائے درد کے اور کچھ نہیں محسوس ہوتا تھا ۔ وہ اسی طرح ، دو ڈھائی سال کے بچے کی مانند ہاتھ کو درد والی جگہ پر رکھے آہستہ آہستہ نیچے اتری ، پلنگ پر نڈھال ہو کر لیٹ گئی ، کراہنے کی آواز سن کر ساس رسوئی سے دوڑی دوڑی آئی ، ساتھ والی گلی سے دائی کو بلایا ۔ اور بابو جی کو دفتر بھیجا ، درد کا گولا پھٹ چکا تھا ۔ کاشو مضطرب تھی یہ سننے کے لئے کہ اس نے اپنی کوکھ سے نیا جنم لیا ہے ۔ دائی نے بچے کو صاف کر کے اس کی ساس کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا "یہ لو اپنا پوتا ۔ میں تو پہلے ہی کہا کرتی تھی کہ بیٹا ہو گا بیٹا ، دیکھو ذرا اپنے باؤ جیسا ہے بالکل باؤ جیسا ؟"

کراہنے کی ساری آواز کاشو کے منہ سے ایک چیخ میں سمٹ کر نکل گئی ۔

(پنجابی سے) ـــــــــــــــ

دلیپ سنگھ دیپ

جب ہونٹ کھلے

باقی سب لڑکے اُس سے دُور دُور رہتے تھے۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ اُن سے عمر میں بڑا تھا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اُس کی عادات اُن سے مختلف تھیں۔ وہ شراب پیتا تھا۔ سگریٹ پھونکتا تھا۔ اور گالیاں دیتا تھا۔ گندی گالیاں جن سے دسویں جماعت کے طالب علم ناواقف ہوتے ہیں۔ 'سالا' تو اس کا تکیہ کلام تھا۔ اس کا استعمال وہ اکثر کلاس میں بھی کرتا تھا۔ ایک دن جب میں نے اُسے پوچھا "تمہاری کتاب کہاں ہے؟" بڑی لاپرواہی سے بولا "ماسٹر جی! وہ سالی تو گھر میں رہ گئی ہے"۔

اس نے اپنی عادات کی وجہ سے اپنے لئے غنڈہ کا لقب حاصل کر لیا تھا۔ ساری کلاس اُسے غنڈہ کہتی تھی۔ میں نے کبھی کسی لڑکی کو اس سے بات چیت کرتے نہیں دیکھا۔ بلکہ اس کا کوئی ہم جماعت لڑکا بھی اُس سے بات نہیں کرتا تھا۔ چند ایک لڑکے جو اُس سے بات کرنا بھی چاہتے تھے۔ اس لئے نہیں کرتے تھے۔ کہ کہیں وہ لڑکیوں کی نظروں میں گر نہ جائیں۔ کیونکہ لڑکیوں کو اس کے گندے اور سوقیانہ مذاقوں نے نہ صرف اُس سے بلکہ اُس کے ہر ملنے والے سے متنفر کر دیا تھا۔

لیکن اُس طبیعت کے آدمی کے لئے اس طرح الگ تھلگ رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اُس کے ساتھ لڑکیوں کو مذاق کرنے میں حصہ لے۔ اُس کے ساتھ مل کر قہقہے لگائے۔ ... ہر طرف سے مایوس ہو کر اُس نے مجھ سے دوستی بڑھانی شروع کی۔ وہ قریباً میرا ہم عمر تھا۔ میں چونکہ کالج سے نیا نیا آیا تھا۔ اس لئے میری عادتیں دوسرے ٹیچروں سے قدرے مختلف تھیں۔ طالب علموں سے دور رہنے کی بجائے اُن میں رل مل کر رہنا پسند کرتا تھا۔ ان پر حکومت کرنے کی بجائے اُن سے دوستی پیدا کرنا بہتر سمجھتا تھا۔

مجھے چونکہ کالج چھوڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کالج کی کئی عادات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا تھا۔ سینما دیکھنے کا شوق بدستور قائم تھا۔ ہفتہ میں کم از کم دو پکچریں دیکھنے کا معمول تھا۔ ... اس نے شاید میری اس عادت کو بھانپ لیا۔ چنانچہ اُس نے میرے ساتھ دوستی بڑھانے کے لئے میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ ایک دن شکروار کو جب میں خالی پیریڈ میں ٹہل رہا تھا۔ وہ میرے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔

"ماسٹر جی! آپ نے فلم "ہم لوگ" دیکھی ہے؟"

"نہیں بھائی۔ دیکھ کیسے سکتا تھا۔ آج تو لگی ہے"۔ میں نے کہا

"آج شام کو دیکھ لیجئے نا"

"آج ٹکٹ ملنے کی امید نہیں"۔ میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگا "اس کی فکر نہ کیجئے۔ میں اوڈین میں گیٹ کیپر ہوں آپ اگر دیکھنا چاہیں تو ٹکٹ آ سکتے ہیں"۔

میں نے اڑھائی روپے نکال کر اُسے دے دیئے جو اُس نے تھوڑی سی لیس و پیش کے بعد جیب میں ڈال لئے اور Recess میں جا کر دو ٹکٹ لے آیا۔ ... اور اس کے بعد اُس نے باقاعدہ طور پر سینما کے ٹکٹ خریدنے شروع کر دیئے۔ ہر نئی پکچر لگنے پر وہ مجھ سے پیسے لے جاتا اور ٹکٹ لے آتا۔ سینما ہال میں بھی وہ کئی دفعہ میرے لئے چائے وغیرہ لاتا۔ ... اور اس طرح وہ میرے قریب آتا رہا۔

میں نے اس کے قریب آ کر محسوس کیا۔ کہ وہ غنڈہ نہیں۔ لوگ اُسے غلط سمجھتے ہیں۔ وہ میری بہت عزت کرتا تھا۔ کہیں بھی ملے۔ نہایت ادب سے نمستے کرتا۔ ہو سکتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہو۔ لیکن وہ شراب پی کر کبھی کلاس میں نہیں آیا۔ کلاس میں کبھی کسی لڑکی کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔ ہاں البتہ اس میں شک نہیں۔ کہ وہ انہیں مذاق کرتا تھا۔ جو بعض اوقات نہایت ہی گندے ہوتے تھے اس کی زبان گندی تھی۔ اور وہ بغیر گالی کے بات نہیں کرتا تھا لیکن یہ ایسی باتیں تھیں جن سے دامن چھڑانا ناممکن ہو۔ اگر وہ کوشش کرے تو وہ گالیوں سے پرہیز کر سکتا تھا اگر کوئی اسے پیار سے سمجھائے

تو شاید لڑکیوں کو بھونڈے مذاق کرنا بھی چھوڑ دے۔

کئی دفعہ میرے دل میں خیال آیا۔ کہ اُسے بلا کر سمجھاؤں لیکن پھر ٹال گیا۔

ایک دن میں نے اُسے سکول کے باغیچہ میں ایک اور لڑکے کے ساتھ باتیں کرتے سُنا۔ وہ کہہ رہا تھا "یار ان دو لڑکیوں نے میرا بُرا حال کر رکھا ہے۔"

"ارے ایسی کیا بات ہے؟"

"تم نہیں جانتے دوست۔ عورت کیا چیز ہے۔ وہ سامنے دیکھو" انگلی سے اشارہ کر کے "اتنی حسین لڑکی تم نے کبھی دیکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ابھی ابھی کسی نے اسے چکنی مٹی سے گھڑا ہو۔ کنوئیں کے پانی سے اُگی ہوئی مولی کی طرح حسین ہے۔ بس ایک بار ہم سے بات کرے۔ ہم پٹا لیں گے۔ ہر روز سینما دکھاؤں گا۔ ہوٹلوں میں لے جاؤنگا بس طبیعت خوش کر دونگا۔"

میں اس سے زیادہ بکواس سننے کو تیار نہیں تھا۔ اُس کی طرف بڑھا مجھے دیکھ کر اس کا ساتھی وہاں سے کھسک گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

"یوں ہی پڑا پڑا دل خوش کر رہا ہوں" وہ بولا۔

"کلاس میں کیوں نہیں جاتے؟"

"گیا تھا" اُس نے کہا "لیکن ڈرائنگ ماسٹر نے کلاس سے نکال دیا۔ کہتا ہے۔ کاپی کیوں نہیں لائے۔ اور کاپی سالی گھر میں رہ گئی ہے۔"

میں نے چہرے پر غصے کے نشان پیدا کرتے ہوئے کہا "یہ بات بات میں سالی کیا کہتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ دسویں جماعت میں پڑھتے ہو۔ اور اتنی گندی زبان بولتے ہو۔ کیا تمہیں اس بات کا بھی خیال نہیں کہ تم اپنے ٹیچر سے باتیں کر رہے ہو۔ اسی لئے ساری کلاس تم سے دُور رہتی ہے۔ کوئی تم سے بات نہیں کرتا۔ سب نفرت کرتے ہیں۔ اگر تمہیں اوروں کا خیال نہیں تو کم از کم اپنا تو خیال کیا کرو۔ انہیں عادتوں کی وجہ سے پچھلے تین سال سے میٹرک میں لڑھک رہے ہو۔ شرم نہیں آتی۔" اور اسے واقعی کوئی شرم نہیں محسوس ہوئی۔ میرے اس لیکچر سے متاثر ہوئے بغیر بڑے اطمینان سے بولا "میٹرک میں پاس نہ ہو سکنے کی اور وجوہات ہیں۔ ماسٹر صاحب! یہیں تو یہ لڑکیاں

امتحان پاس نہیں کرنے دیتیں۔ ان کی طرف سے خیال ہٹے۔ تو اس طرف لگے۔ بُرا نہ مانیئے ماسٹر صاحب! آپ ہمارے دوست ہیں۔ کم از کم میں آپ کو ماسٹر سے زیادہ دوست سمجھتا ہوں۔ آپ کو بتلائے دیتا ہوں۔ کہ میں رنجی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اگر وہ میرے ساتھ صرف باتیں ہی کر لیا کرے تو میری تسلی ہو جائے۔ لیکن وہ بولتی ہی نہیں۔ میں آپ کو بتاؤں۔ میں رنجی سالی کو اٹھا........

"بکواس مت" میں گرجا "ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہیں ان لڑکیوں کو بہنیں سمجھنا چاہئے۔ سب لڑکے ٹھیک ہی تمہیں غنڈہ کہتے ہیں۔ تم غنڈے ہو کیونکہ تم غنڈوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ تم غنڈے ہو۔ اس لئے کہ تمہارے دل میں ماں بہن کسی کے لئے کوئی عزت نہیں۔ تم ذلیل ہو۔ گندے ہو۔ کمینے ہو۔ کیڑے مکوڑے ہو"

ایکدم مجھے اس قدر غصہ آ گیا۔ کہ میں زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور وہاں سے چل دیا۔ اس رات میں سو نہ سکا۔ ساری رات اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ میں کیوں اس کے اس قدر قریب آیا۔ اگر میں نے اپنے اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ رکھا ہوتا۔ تو شاید اسے میرے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا۔ کہ استاد اور شاگرد کے درمیان کچھ فاصلہ ضرور ہونا چاہئے کچھ فرق نہایت ضروری ہے اگر دونوں کے تعلقات میں دوستوں ایسا ربط پیدا ہو جائے۔ تو ٹیچر اپنے فرض کو ٹھیک طرح سے پورا نہیں کر سکتا میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ سوائے کلاس کے اُس سے کبھی بات نہیں کرونگا۔

.....اور اس کے بعد میں نے واقعی اس سے بولنا ترک کر دیا۔ اس نے ایک آدھ بار کلاس کے باہر کچھ کہنا بھی چاہا مگر میں نے ٹال دیا۔

ایک مہینہ اس طرح گذر گیا۔ میں نے اُس کے بارے میں سوچنا ترک کر دیا۔ انہیں دنوں میری سکول کے منیجر سے ان بن ہو گئی اور مجھے نوکری سے ـــــــ نکال دیا گیا۔ ان دنوں وہ مجھے کناٹ پلیس کی ایک پارک میں مل گیا۔ اور بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

"کیوں ماسٹر جی! ابھی تک ناراض ہو؟"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا.....اب اُس سے ناراض ہونا

کچھ مطلب نہیں رکھتا تھا۔ بیکار رہنے کی وجہ سے اب میں اُستادوں والی نصیحت آمیز تقریریں کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اور اگر میں تیار ہو بھی جاتا۔ تو وہ میری کب پرواہ کرتا۔ میں اس کے سکول کا ٹیچر تو تھا نہیں۔ لہٰذا میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"نہیں کرشن دوست (کرشن اس کا نام تھا) تم سے بالکل کوئی ناراضگی نہیں۔"

"آج کل آپ سینما دیکھنے نہیں آتے؟"

"پیسوں کی کمی کی وجہ سے سینموں میں کمی کر دی ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی آنکھوں میں ایک ننھی سی چمک پیدا کی۔ سر کو ایک خاص انداز سے جھٹکا دیا۔ اور کہا۔ "اجی پرواہ نہ کیا کرو۔ آ جایا کرو۔ ہم دکھا دینگے۔ آپ ہمارے یار ہیں ماسٹر صاحب؟"

وہ مجھے وہاں سے اٹھا کر لے گیا۔ اور پکچر دکھائی۔ اس کے بعد میں ہر نئی پکچر پر اُسے ملتا۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح سے مجھے ہال میں بٹھا دیتا۔ کبھی پاس لا کر۔ کبھی پیسے خرچ کر کے اور کبھی یونہی۔

اب میرے اور اس کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اب مجھے "آپ" بھی نہیں کہتا تھا۔ بلکہ نام سے بلاتا تھا۔ مجھے ان دنوں ایک دفتر میں کلرکی مل گئی تھی۔ خود میرے دماغ سے "استادی" کی بو نکل چکی تھی۔ اور میں اس کے سلوک کے تغیر سے نالاں نہیں تھا۔ میں نے کبھی اُس کے رویے کا بُرا نہیں منایا۔ اب وہ میرے ساتھ سکول کی لڑکیوں کے بارے میں کھلم کھلا باتیں کرتا تھا۔ تو میرے دل میں اُسے نصیحت کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اُس کی باتیں بڑے انہماک سے سنتا تھا۔ اور اگر ممکن ہو سکے تو کوئی صلاح مشورہ بھی دیتا تھا۔

ایک دن وہ ان لڑکیوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں کہنے لگا۔ میرے یار اگر مجھے رجی سے باتیں کرنے کا موقعہ مل جائے۔ تو میں پٹا لونگا۔ صرف موقعہ ملنے کی دیر ہے۔ میں نے اسے بتایا۔ کہ اس میں کامیابی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے آپ میں کچھ تبدیلی پیدا کرے۔ طرز گفتگو کو بدلے گالیاں دینا چھوڑ دے .... اس نے میری نصیحتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ کہ اُس کی تبدیلی سے اگرچہ لڑکیاں عملی طور پر تیار تو نہیں ہوئیں لیکن ایسی فضا ضرور پیدا ہو رہی ہے۔ جب وہ اُس سے بات کرنے میں جھجکاہٹ محسوس نہیں کریگی۔

انہیں دنوں اوڈین پر کوئی نئی تصویر لگی۔ مجھے اُس نے پکچر دکھانے کے لئے بلایا۔ میں دفتر سے سیدھا اوڈین پہنچا فلم شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ لیکن وہیں کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے باتیں کرنا شروع کیں۔ یکایک وہ بولا۔ "یار خدا ایک طرف ہو جا۔ وہ دونوں آ رہی ہیں۔"

میں وہاں سے ہٹ کر منیجر کے دفتر کے پاس سیڑھیوں میں جا کھڑا ہوا۔ لڑکیاں اندر آ گئیں۔ اُس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے انہیں بلا ہی لیا۔ اس وقت اس کے چہرے کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں گھبراہٹ کی وجہ سے زیادہ تیزی سے چل رہی تھیں۔ اور اُس کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو رہا تھا۔ ..... اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بمشکل یہ الفاظ ادا کئے۔

"آپ فلم دیکھنے آئیں ہیں؟"

اور رجی نے بغیر کسی گھبراہٹ سے کہا۔ "ارادہ تو ہے۔ لیکن ٹکٹ ملتے نظر نہیں آتے۔" اور ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر لٹکتے ہوئے HOUSE FULL کے بورڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ یہ کہہ کر کہ آپ ٹھہریے میں لا دیتا ہوں سینما کے بڑے دروازے سے باہر کی طرف بھاگا۔ اور نہ جانے کہاں سے دو ٹکٹیں لے آیا۔

دونوں لڑکیوں نے مشکور نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ رجی نے اپنی جیب سے پیسے نکالے۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر کہ "پکچر شروع ہونے والی ہے۔ بعد میں دیکھا جائیگا۔" انہیں اندر بھیج دیا...... اور اُس کے بعد وہ میرے پاس چلا آیا...

اس کی سانسیں بُری طرح پھول رہی تھیں گویا کسی مقابلے کی دوڑ میں دوڑ کر آ رہا ہو۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی روشنی، ہونٹوں پر کھلتا ہوا تبسم اور پھولے ہوئے نتھنے اس بات کے شاہد تھے۔ کہ اُسے اس دوڑ میں جیت ہوئی ہے اُس نے نہایت گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ اور کہا کہ "اب

بات ختم نظر آتی ہے۔ میں نے پیسے نہیں لئے۔ اور پھر اس نے اپنی آنکھوں کو نیم باز کر کے رجی کا نام لیا۔ اور ایک عجیب طرح کی ہلکی سی چیخ ملی۔ اور کہنے لگا "یار تم آج پکچر نہ دیکھو۔ سامنے ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

میں نے چائے کا ذائقہ لیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو دوست سمجھ کر بات کرنا ورنہ بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔"

"تم پرواہ نہ کرو میں نے سینکڑوں فلمیں دیکھی ہوئی ہیں بہت سے ڈائیلاگ یاد ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ پیسے ضرور دیگی۔ میں انکار کر دونگا۔ کہونگا "اجی رہنے دیجئے۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آپ اڑھائی روپے کے لئے اتنی ضد کر رہی ہیں۔ یہ تو ایک نہایت ہی معمولی چیز ہے۔ مجھ سے تو ہو سکے تو ساری کائنات کو آپ کے قدموں پر نثار کر دوں۔ آسمان کے تارے توڑ کر آپ کی اوڑھنی میں سجا دوں۔ تمہاری مانگ میں لالہ زاروں کا سندور بھر دوں۔"

"اس قسم کی بکواس نہ کرنا۔" میں نے کہا۔ "کہیں عشق ہوتے ہوتے کچھ اور ہی نہ ہو جائے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "یہ تو میں یونہی شاعری کر رہا تھا۔ فرض کرو وہ پیسے [illegible] ہی نہ کریں۔ تو مندرجہ بالا عبارت تھوڑا ہی دہراؤں گا۔ موقع دیکھ کر بات کرونگا۔ ایک دفعہ انہیں بات کرنے دو۔ ایک دفعہ —— بس ایک دفعہ ان کے ہونٹ کھلنے دو۔ پھر دیکھنا کیا رنگ جماتا ہوں۔

ہم بہت دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ فلم ختم ہو گئی۔ میں اُسے گیٹ کے قریب چھوڑ کر ذرا پیچھے کی طرف رک گیا۔ جب لڑکیاں باہر نکلیں۔ تو وہ انہیں گیٹ پر ہی مل گیا۔

وہ اُسے دیکھ کر رک گئیں۔ رجی نے جیب سے پیسے نکالے اور کہا۔

"کرشن بھائی۔ تمہاری بہت مہربانی" اور پیسے اس کی طرف بڑھا دیے۔

کرشن نے "رہنے دیجئے" کہا اور خود کو ذرا پیچھے ہٹا لیا۔ لیکن رجی نے اصرار کیا۔ اور کہا "لے لو بھائی۔ تم ہمارے لئے پیسے کیوں خرچ کرو؟" اور پھر چہرے پر ہلکا سا تبسم پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "ہم ہم نے دیکھی ہے یہ جرمانہ تمہیں کیوں پڑے؟"

اور کرشن نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ میں الجھاتے ہوئے کہا "اس لئے . . . . . ." اس کی آواز بُری طرح کانپ رہی تھی۔

"اس لئے ... کہ ... اپنی .... بہنوں ... اپنی بہنوں کے لئے بھی تو خرچ کرتا ہوں" اور وہ تھوک نگل گیا۔

بقیہ "تضاد"

کرتے کرتے ملد چڑھنے لگا۔ اس نے انگڑائی لی اور سو گیا۔ رات بھونیا وقفہ سے غافل انیس چین کی نیند سوتا رہا۔ صبح پانچ بجے فیروز نے اسے جگایا۔ اس نے اپنا اوورکوٹ پہنا اور کوٹھے کی سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ وہیں سے نکل کر سیدھے گرجا کا رخ کیا۔ کچھ دور تک گے بڑھا ہو گا کہ اسے پیچھے کچھ شور سنائی دیا۔ مڑ کر دیکھا [illegible] آدمی جمع تھے۔ وہ ان لوگوں کے پاس گیا۔ دیکھا ایک انسان مرا پڑا تھا۔ لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے "بھوک سے مر گیا بیچارہ" انیس کے دماغ پر ایک زور دار [illegible] اور اس کو چکر آنے

پاکستان کے قارئین

"پگڈنڈی" کی رقم مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کر کے اس کی منی آرڈر رسید ہمیں بھیج دیں۔

چودھری نذیر احمد

نیا ادارہ - ۱۵ سرکلر روڈ لاہور

تانے بانے

خزاں ہوشیارپوری

جالندھر
۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء

بھائی میرے !

سوچتا ہوں کیا لکھوں کیا نہ لکھوں !

بقول مولانا آزاد کے زندگی میں بہت سی کہانیاں لکھیں۔ خود زندگی ایسی گذر رہی ہے۔ جیسے ایک کہانی ہو۔

ہے آج جو سرگزشت اپنی کل اس کی کہانیاں بنیں گی

مجھ سے اب ایسی حرکتیں بھی سرزد ہونے لگیں ہیں۔ جن سے کبھی کبھی مجھے خود بھی پشیمانی ہوتی ہے۔ کچھ تو مجبوراً کرتا ہوں۔ تو کچھ دانستاً۔ اس وقت میرے جذبات کا کچھ عالم ہی ایسا ہوتا ہے۔ انجام سوچ بھی لوں تو بھی جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ آپ اسے میری کمزوری ہی سمجھئے۔ مگر میں اسے مجبوری خیال کرتا ہوں۔

بھائی میرے ! یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مجھے کل سے محبت ہے۔ مگر اس پر بھی .... اگر میں اسے نہ پا سکا۔ تو کوئی عظیم حادثہ نہ ہوگا۔ میں اس حادثہ کو بھی عام حادثوں میں شمار کر لوں گا۔ دراصل اب میں ایسے حادثوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میری زندگی کن کن مشکلات سے گذری ہے۔ یہ تو ایک فطری جذبہ تھا۔ جو میں اپنے دل کی بات ظاہر کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ بچپن کا نقش تھا۔ بیسیوں مرتبہ وہ بھابی کے ہمراہ آئی تھی۔ اور بیسیوں ہی مرتبہ مجھے بھابی کے ہمراہ کل کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ پھر بقول آپ کے رشتے کے لئے بھی کوشش جاری تھی۔ پھر بھلا محبت کیوں نہ ہوتی۔ مگر اس کے باوجود میں نے سینکڑوں مرتبہ کوشش کی کہ اس محبت کے نقش کو دل سے مٹا دیا جائے۔ مگر ہر بار ناکامی ہوئی۔

آخر حرفِ مدعا زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اس سے طبیعت کا بوجھ تو کچھ ہلکا ہو گیا۔ ورنہ یہ حسرت دل میں رہ کر نہ جانے کیا رنگ لاتی۔ آپ حیران تو ضرور ہونگے کیا رنگ برنگ کی طبیعت لایا ہوں۔ برادر! قدرت کا عطیہ ہی یہ طبیعت ہو تو اس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔

نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

ہر بار کوشش کی کہ اپنے دل کو سمجھاؤں مگر ہر بار فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوا۔ انسان کی زندگی کا مقصد اگر صرف جذبات تک ہی محدود ہوتا تو وہ یقیناً دنیا میں ایک فاتح کی حیثیت سے جیتا۔ وہ اپنی آزادی کے لئے اپنے جذبات کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیتا۔ جیسا کہ میں نے خود کیا ہے۔ مگر آج میں محسوس کر رہا ہوں کہ انسان اپنے جذبات کے علاوہ فطرت کے ہر اصول کا غلام ہے۔ یہ سبق میں نے ایک بہت بڑی قربانی دے کر حاصل کیا ہے۔ کوشش کرونگا کہ آئندہ زندگی سنبھل جائے۔ اگر فطرت پھر نہ کہیں بہکا دے تو۔ ....

میرا خیال تھا کہ انسان آزاد ہے کہ ہر چیز پر اپنا قبضہ کر سکتا ہے۔ مگر میرا یہ خیال بہت حد تک غلط نکلا۔ انسان ہمیشہ سے غلام چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ کسی اور کا نہیں تو خود اپنا غلام ہے۔ اپنی ہوس کا اپنے نفس کا بہر حال وہ غلام ضرور ہے۔ خواہ کسی بھی

گنڈاسی امرتسر

طاقت کا ہو۔ مگر از کم ہماری دنیا کا انسان تو ہر بات سے بے نیاز نہیں پایا گیا۔ کسی اور دنیا کا ہو۔ تو میں کہہ نہیں سکتا۔

دوپہر ڈھل رہی ہے۔ اور جس جگہ بیٹھ کر میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں وہاں انسان تو کیا کوئی چرند پرند تک نزدیک نہیں پھٹکتا۔ بھائی صاحب! اگر میں شاعری یا افسانہ نویسی سے دل نہ بہلاتا رہوں۔ تو میرا دماغ بقول مولانا آزاد کے بے کیف اور خشک مشغولیتوں کے بارِ مسلسل سے تھک کر معطل ہو جائے۔ انسان تصور میں کتنے پیارے پیارے ہوائی قلعے بناتا ہے۔ اور کبھی کبھی خود ہی ان قلعوں کو مسمار کر کے ایک انجانی راحت محسوس کرتا ہے۔ میں نے بھی تصور میں ایک ہوائی قلعہ بنایا ہے۔ جس کو زمانے کے بڑے بڑے طوفان اور آندھیاں گرا دینا چاہتے ہیں۔ میں نے اس قلعہ کو بچانے کے لئے کئی ایک کوٹ وار بھی بنایا ہے۔ اور مدد بھی چاہی ہے۔ جن میں سب سے زیادہ مناسب آپ کی شخصیت ہے۔ برادر! اکثر سے محبت ایک تخیل ہی تو ہے۔ اور اسی تخیل کے سہارے قلعہ تیار کرنا بھی اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو اور ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجئے۔

تو بھی آ کر مجمعِ اجداد دیکھ ایک ہنگامہ ہے تنہائی میری

برادر! جس شخص سے میرا تعلق جس حیثیت سے ہے۔ میں اسے اسی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنی حیثیت سے کسی دوسرے کی حیثیت کو خراب کروں۔ میں اس بات کا ہمیشہ خواہاں رہا ہوں کہ مجھے کوئی علم خاص حاصل ہو جائے جس سے میں دنیا کی صحیح نبض پہچان سکوں۔ فقط

وہی جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی گئی

سوشیل

جالندھر

۲۴ر جولائی ۱۹۵۲ء

برادر!

آپ حیران تو ضرور ہوں گے ابھی کل ہی تو خط لکھا تھا۔ آج پھر لکھنے بیٹھ گیا ہوں .... خط میں خود نہیں لکھتا بلکہ میرے جذبات مجھ سے لکھواتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ میں اپنے جذبات قلمبند کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہوں۔ دوپہر کو قیلولہ کے بعد قریب پانچ بجے کے قریب جب گھر سے کسی ویران علاقے کی طرف نکل جاتا ہوں۔ تو پھر رات پڑنے تک کسی کا مجھے تلاش کرنا فضول ہوتا ہے۔ اس وقت میں ایک حکمران کی حیثیت سے اپنی حکومت میں ہوتا ہوں۔ تنہائی میرے لئے ایک جلسہ گاہ ہوتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے گرد ہزاروں لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ کچھ تو پہلے سے انتظار کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ کچھ جوق در جوق آ رہے ہوتے ہیں۔ اور ایسے عالم میں میں بڑے فخریہ انداز سے اپنے تجربات جو میں نے زندگی میں ڈوب کر حاصل کئے ہیں۔ بیان کرنے لگتا ہوں۔ اور اب مجھے یہ بھی اندیشہ ہونے لگا ہے۔ کہ کہیں میرا یہ جنون حقیقت نہ ہو جائے۔ ایک مقرر کی حیثیت سے ہزاروں لوگ میدان میں آئے اور زمانہ نے انہیں فنا کر دیا۔ زمانہ ایک زبردست منصف ہے۔ اس کے آگے میری کیا بساط؛ مانا کہ دنیا میں ہر شخص ایک رائے کی پرستش نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی کہنے والے کو حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ اپنی بات کہے۔ یہ تو ہمارا فرض ہے بقول غالب

روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

میرے خیال میں سننے والے کا کہنے والے سے فرض بڑا ہے۔ کہ وہ ہر بات کو ہر پہلو سے سوچے اور غور کرے۔ انسان ہمیشہ سے اپنی مرضی کرتا چلا آ رہا ہے اور یہی انسان بعض دفعہ ایک پانچ سالہ بچہ کی باتوں پر غور کرتے ہوئے پایا گیا ہے۔

سو برادر! اگر کسی وقت عالمِ جوش میں چھوٹا منہ بڑی بات کہہ بیٹھتا ہوں تو اس لئے نہیں کہ تم ان باتوں کا بُرا مناؤ بلکہ اس لئے کہ تم

گذشتہ سے پیوستہ

بھی انسانی زندگی کے ہر پہلو پر غور کرو۔ جس طرح میں زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری یہ خواہش ہے کہ ہر شخص ایسا کرے۔ زمانے سے دو قدم آگے چلنا تو بہت بڑی بات ہے کم از کم ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ ضرور چلنا چاہئے۔ کیونکہ دنیا پیچھے رہ جانے والوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ یہ ظالم دنیا کسی کی خطا نہیں بخشتی۔ اور اگر تم اچھی طرح موجودہ حالات کو سمجھتے ہو کہ اس دنیا میں ہر شخص ایک دوسرے کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور جب ایسا ہے تو ہم کیوں اپنی کمزوریوں کو عیاں کر کے دوسروں کو مذاق کا موقع دیں۔ میں اس دور میں بڑے مجبور انداز سے جیتا ہے۔ میری طرف دیکھو زندگی کی اس قدر تلخیوں کے باوجود جیل بھی جاتا ہوں۔ بڑے خوددار اور غیور کی حیثیت سے۔

قلم کے بارے میں جو کچھ میں نے آپ سے لکھا ہے۔ اس کام کو بڑی سوچ سمجھ سے کرتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہاری عزت میں فرق آئے۔ میرا کیا ہے ؛ بقول اقبال تمام عمر سہنے کو پڑی ہے۔

؎ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

پچھلے خط میں، جہاں میں نے اپنے مضمون نگار ہونے کا دعوےٰ کیا تھا۔ وہ صرف میری خود اعتمادی ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں افسانہ نویسی۔ ایک اچھا اور ٹھوس حقیقت پر مبنی مضمون لکھنا کوئی سہل کام نہیں۔ ایک مضمون نگار کو ایک اچھا مضمون تخلیق کرنے کے لئے خون جگر پینا پڑتا ہے۔ اور محنت کی یہ حالت ہو کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات بیان کرنے کے لئے کئی کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔

؎ تب کہیں آتی ہے اک مصرعہ تر کی صورت

میرا ان سب باتوں کو لکھنے کا صرف یہی مطلب ہے کہ کہیں آپ میری شخصیت کا غلط اندازہ نہ لگا بیٹھیں۔ بلکہ مجھے آگے بڑھنے میں میری حوصلہ افزائی کریں۔

برادرا علم تو ایک سمندر ہے۔ کسی نے یہاں سے گھڑا بھر لیا تو کسی نے لوٹا۔ میرے حصے میں بھی ایک چھلنی آئی۔ جب کبھی بھرتا رہا۔ تمام کا تمام بہہ جاتا رہا۔ اب ایک اچھے برتن کی تلاش میں ہوں۔ بلکہ کوشش یہ ہے کہ اس برتن کو بھی خود بناؤں۔ بقول جگر مرادآبادی۔

؎ اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہل دل ؎ ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے خط میں نے اپنی ذہنی کیفیت خوب کھول کر بیان کر دی ہے۔ اور آپ میری پوزیشن کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے ضرور میری رہنمائی کریں گے۔ فقط۔

اک تسلی بخش جواب کا منتظر
سوشیل

جالندھر
۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء

برادرا

یہ لکھنے کا شوق بھی ایک خبط ہے۔ وہ جذبات کی ہنگامہ آرائیاں ....
جب انسان جذبات سے مغلوب ہو تو وہ اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے لئے چاہتا ہے کہ کوئی اس کی باتیں سنے۔ اگر اس وقت اسے کوئی مناسب آدمی نہ ملے جس سے وہ اپنے جذبات بیان کر سکتا ہو۔ تو پھر وہ جذبات نوک قلم سے آشنائی چاہتے ہیں
میری دماغی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔
رات کے بارہ بجے ہیں۔ ہاتھ میں قلم تھامے ہوئے آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ یہ کیفیت آج واقعی میں ہی ہوگئی۔

ابھی کل ہی میں "غبارِ خاطر" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ کسی کسی جگہ اپنے جذبات کی ترجمانی دیکھ کر میرا دل بھی آپ کو کچھ لکھنے کے لئے مچل اٹھا اتنی رات گئے ہاتھ میں لیمپ لے کر نیچے کمرے میں آنا پڑا۔ نہ معلوم ہمسائے کیا خیال کرتے ہونگے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ میں آپ سے باتیں کرنے میں مصروف ہوں۔ برادرا زندگی کے بازار میں اپنے مطلب کی چیزوں کی بہت سی تلاش کی تھی مگر نہ پاسکا۔ تو اب ایک نئی الجھن میں مبتلا ہوں۔ اپنا کھویا ہوا سکون ڈھونڈھ رہا ہوں۔ میں نے ہزار مرتبہ کوشش کی ہے۔ کہ کسی کی یاد نہ آئے مگر اکثر ناکام رہا۔ بڑا ہی اداس دل کی لگی کا...... تنہائی میں بعض اوقات یہ دل بھٹک ہی جاتا ہے۔ چونکہ مجھے کسی کی ہر خواہش عزیز ہے۔ اس لئے اسے اپنی خوشی کرنے دیں۔ میں اپنی ان تحریروں سے اپنا دل بہلا لیا کرونگا۔ کبھی کبھی مجھے لکھتے ہوئے یہ احساس ہونے لگتا ہے۔ جیسے کہ میں ایک بہت بڑا کام کر رہا ہوں۔ بعض اوقات تو اپنی تحریروں کو پڑھ کر جھوم جھوم اٹھتا ہوں۔ اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ میری یہ نگارشات اشاعت کے قابل ہیں تو خود اعتمادی حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اور اپنے مستقبل کو ایک نئے روپ میں دیکھنے لگتا ہوں۔ مولانا آزاد ایک جگہ یوں لکھتے ہیں۔ "کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوں۔ آدمی اپنے آپ کو عام سطح سے ذرا بھی اونچا کرلے تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کر سکے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ اور زندگی بہر حال بسر ہو ہی جاتی ہے۔" یہ کسی حد تک ٹھیک ہے۔ مگر زندگی کا دارو مدار محض کھانے پینے اور ساز و سامان پر ہی نہیں ہوتا۔ ہمیں زندہ رہنے کے لئے اور بھی بہت سی باتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ باپ کی شفقت۔ ماں کی ممتا۔ بہن بھائی کا پیار، انسان دنیا میں رہ کر دنیاوی خواہشات سے دور نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک فطری اصول ہے۔ اور فطرت کے خلاف جو بھی قدم اٹھائے گا۔ خطا کھائے گا۔ میری شادی کا نہ ہونا بھی تو فطرت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہی تو ہے؟ اور یہی وجہ ہے کہ قلم گھسیٹے جا رہا ہوں۔ میری ان باتوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے۔ امید کہ آپ میرے الفاظ کا برا نہ مانیں گے۔ اب اگر کہیں میں نے آپ کے ماتھے پر شکن دیکھ لی۔ تو طنز سے باز نہیں رہ سکونگا۔ بقول مرزا غالب

ع تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

آج دن کے وقت جب میں حسبِ معمول گھر سے نکلا تو ایک شکستہ اور خستہ حال مسجد کی طرف جا نکلا۔ اندر جھانک کر دیکھا تو جا بجا مکڑی کے جالوں سے اٹی پڑی تھی۔ فرش بے حد گرد آلود تھا۔ حتیٰ کہ کہیں کہیں کیچڑ سوکھا ہوا یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے کہ کسی گل اندام حسینہ کے نرم و سرخ لبوں پر خشکی اور کثافت کی پیپڑیاں جمی ہوں۔ دیواروں میں جا بجا شگاف پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بالکل تعجب نہیں ہوا۔ بلکہ میرا کھویا ہوا سکون مجھے کچھ دیر کے لئے مل گیا۔ میں بے اختیار اور والہانہ اس شعر کو پڑھنے لگا۔

ع میں مطمئن ہوں مسجدِ ویراں کو دیکھ کر میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

میں نے اس شعر کو ان گنت بار دہرایا اور تب پڑھنا بند کیا۔ جب دیکھا کہ ایک شخص کھانستے ہوئے اس طرف رفع حاجت کے لئے آرہا ہے۔ اس نے دیوار کی اوٹ میں اپنا کام شروع کر دیا۔ اور میں کمبخت کو دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے گھر واپس چلا آیا۔ امید کہ آپ خوش ہونگے۔

مخلص

سوشیل

یہ نہایت ضروری ہے

کہ مضامین کی واپسی اور جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ ارسال فرمائیے۔ نمونہ کی طلب کرتے وقت ۱۴ آنے کے ٹکٹ بھیجئے۔ تاکہ جلد تکمیل ہو سکے۔

منیجر

اسد حسین ایم۔اے

جلسہ ختم ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں [illegible] انیس بھی [illegible] اپنے گھر کی طرف چل نکلا۔ جلسہ ہندوستان کے فاقہ نصیب انسانوں کی امداد کے سلسلہ میں تھا۔ کافی کامیاب رہا۔ پبلک نے دس ہزار روپے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ خوب ہی پرجوش تقریریں ہوئیں۔ ہندوستان کی اسوقت جوناگفتہ بہ حالت ہورہی ہے اس کا حال کسے معلوم نہیں۔ ہزاروں آدمی اب تک موت کا شکار بن چکے ہیں۔ کتنے ہسپتال میں ہیں۔ جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ کتنے فٹ پاتھ پر پڑے ہیں تو کتنے ہی ایسے ہیں جو دیں پڑے دم توڑ رہے ہیں۔ اخبار کے ذریعہ جو تصویریں ہم نے دیکھی ہیں اسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ تصویریں تو انسانوں کی ہیں لیکن بدن میں ہڈی اور پسلی کے سوا کچھ نہیں دکھتا۔ اگر ایسے وقت میں بھی ہم ان کی امداد نہ کریں تو پھر کب کریں گے۔ تقریر کی ساری باتیں انیس کو دماغ میں چکر لگا رہی تھیں اور وہ سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ کسی کی نحیف آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے فوراً اپنی بائیں جانب فٹ پاتھ کی طرف مڑ کر دیکھا ایک شخص جس کی عمر چالیس کے قریب ہوگی بوسیدہ کثیف کپڑوں میں ملبوس زمین پر پڑا تھا۔ اس کے کپڑے ناداری و افلاس کا پتہ دے رہے تھے۔ اس کا لاغر اور نحیف جسم۔ اس کی کمزور اور دلگداز آواز اور اس کے لرزتے ہوئے لب ظاہر کر رہے تھے کہ وہ چند دنوں کا مہمان تھا۔ اس کے چہرے اور آواز سے نقاہت عیاں تھی۔ اس کی قوت زائل ہوچکی تھی۔ اس کی آس ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی حسرتوں پر پانی پھر چکا تھا۔ اس کی امنگوں اور تمناؤں کا خون ہو چکا تھا۔ اس کی ہستی پامال ہوچکی تھی۔ اور اب وہ مٹی ہوئی آرزوں کا ڈھیر تھا۔ اب اس کے دل سے ایک آہ سنائی دیتی تھی۔ ایک بے قرار آہ جس میں درد پنہاں تھا لیکن اس آہ کا سننے والا کوئی نہ تھا۔ اب اس کے پاس صرف دل کی ایک ویران دنیا رہ گئی تھی۔ اس ویران دنیا میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ جس کے شعلے لوگوں تک پہنچتے تو تھے لیکن ان شعلوں کو بجھانے کی کسی میں تاب نہ تھی۔ اقتصادی مصائب کے ہاتھوں ہزاروں گھرانے تباہ و برباد ہوگئے۔ یقیناً یہ بھی فلاکت و عسرت کا مارا انسان تھا۔ وہ ایک مسافر تھا جو اندھیری رات میں ٹھہر ٹھہر کر سفر کر رہا تھا۔ وہ اب بہت تھک چکا تھا۔ لیکن اس کی منزل اب بہت دور نہ تھی۔ دور سے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس لئے اسے ڈھارس تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھائے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا چہرہ بشاش نظر آنے لگتا تھا۔ چراغ بھی گل ہونے سے پہلے ٹمٹمانے لگتا ہے۔ اور آخری وقت بھڑکنے لگتا ہے۔ ایک تیز روشنی ہوتی ہے پھر بجھ جاتا ہے۔ آفتاب کی آخری کرنیں مدھم پڑنے لگیں تھیں۔ اور دھندلکا ہو چلا تھا۔ انیس کچھ دیر کے لئے اس کے پاس خاموش کھڑا ہوگیا۔ وہ بار بار کچھ کہہ رہا تھا۔ باوجود سخت کوشش کے بھی آواز صاف نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے انیس اتنا سمجھ سکا کہ وہ کئی دنوں کا بھوکا ہے اور کچھ امداد چاہتا ہے یوں تو اس کی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بہت سے الفاظ نکل رہے تھے لیکن "بابو بھوکا" کچھ زیادہ صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کی آواز لمحہ بہ لمحہ دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ انیس کو اس پر بڑا ترس آیا اور اس نے فوراً اپنی جیب کا جائزہ لیا لیکن اس وقت اس کی جیب میں سوائے دس روپے کا نوٹ کے ایک پیسہ بھی ریزگاری کا نہ تھا جس سے وہ اس کی مدد کرتا۔ اپنی مجبوری پر انیس کو افسوس تو ضرور ہوا لیکن کیا کرتا۔ آگے بڑھ گیا اور برابر آگے بڑھتا گیا۔ لیکن وہ مطمئن بالکل نہ رہ سکا۔ اور اس کا خیال اس کے دماغ میں یکساں رقص کرتا رہا۔ اس وقت انیس کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ بہت ہی انہماک سے سوچنا شروع کیا "کیا کسی کی امداد پیسے دو پیسے، آنہ دو آنے تک ہی محدود ہے" کیا کسی کو اس سے زیادہ دینا گناہ ہے۔ کیا اگر میں ایک روپیہ ہی اسے دے دیتا تو کسی گناہ کا مرتکب ہوجاتا لیکن ایک روپیہ میں اسے کیونکر دے سکتا تھا۔ یہ تو اس کے لئے بہت زیادہ تھا اور یقینی وہ ایک روپے کے قابل نہ تھا۔ پھر ممکن ہے ضرورت کے وقت میرے ہی پاس روپے گھٹ جائیں۔ آج کل روپیہ ذرا بچا کر خرچ کرنا چاہئے۔ اب روپے نکالتے وقت ذرا آگے پیچھے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی روپے

[illegible] وقتوں میں کسی کے

[illegible] وقتوں کا مشہ دیکھنا پڑے

[illegible] انیس آگے بڑھ گیا۔ پھر بھی اسے اطمینان نہ تھا [illegible] کہ وہ ایک حساس طبیعت انسان واقع ہوا ہے اور اس نے اکثر اپنے متعلق لوگوں کو یہ رائے پاس کرتے سنا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور چل رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں ایک خیال آیا وہ یہ کہ اگر وہ اپنے سارے جذبات و احساسات کو کاغذ پر سیاہ دھبتوں کی شکل میں اتار دے تو وہ انسانہ کی شکل میں یکجا ہو کر خوب ہوں گے۔ اور یہ سوچ کر اسے بہت مسرت حاصل ہوئی۔ لیکن کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک دوسرے ہی خیال نے اسے آگھیرا اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش کھڑا ہو گیا۔ جو خیال اس کے دماغ میں اب آیا وہ یہ تھا" وہ انسان ہی کیا جس پر کسی کی آہ کا اثر نہ ہو۔ وہ انسان ہی کیا کہ کسی کی ٹیس کا اس کے دل میں درد نہ ہو۔ کسی کے درد کا اسے احساس نہ ہو۔ کسی کے آنسو بہنے کا اُسے افسوس نہ ہو۔ زمانے کی کج رفتاری کا تو مجھے رنج نہیں۔ ملک کی زبوں حالی کا مجھے علم نہیں کوئی سڑک پر بھوکوں مرجائے اس کا مجھے غم نہیں بلکہ خوشی ہے تو اس بات کی کہ مجھے ایک اچھا افسانہ ہاتھ آگیا اور اصل اہمیت جو میں نے دی وہ اک اچھا افسانہ مل جانے کو" یہ سب خیال آتے ہی انیس اور زیادہ منہمک ہو کر سوچنے لگا اور اس وقت وہ اپنے سر پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس نے یک بیک چلنا شروع کر دیا۔ اور راستہ میں سارے واقعات آہستہ آہستہ بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر یہ مصرعہ ہلکے ہلکے سروں میں گنگنانے لگا۔

"دو روزہ کی عمر فانی سے غم اس میں گوارہ کون کرے"

اب اسے پریشانی کچھ دور ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ طبیعت بشاش معلوم ہونے لگی۔ اضمحلال دور ہوتا دکھائی دیا اور قلب کو سکون ملنے لگا۔ تاریکی کی جگہ اجالے نے لے لی۔

چلتے چلتے اپنی جانب فٹ پاتھ پر فلم "تان سین" کا پوسٹر دیکھنے کھڑا ہو گیا "سہگل اور خورشید" وہ اچھل پڑا۔ ارے یہی دونوں تو بھگت سورداس "میں بھی تھے۔ خوب ہی گاتے ہیں۔ خاص کر خورشید کا وہ گانا اسے کتنا پسند ہے کہ

"پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے"

نظر اٹھا کر دیکھا فیروزہ حسب معمول کھڑکی پہ بیٹھی تھی یوں تو وہ اسے کوئی خاص طور پر پسند نہ تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت وہ اسے بڑی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ فیروزی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے سوچا کیا ہی خوب ہے "فیروزہ فیروزی" طبیعت میں ہیجان پیدا ہوا پہلے اس نے کچھ دیر سوچا پھر فوراً ہی اپنی جیب کا جائزہ لینے لگا۔ سوچا صرف چار ہی روپے تو اس کی فیس ہے۔ کوئی زیادہ بھی نہیں۔ کچھ پان اور سگریٹ میں لگیں گے۔ سڑک پر دونوں جانب ایک تجسس آمیز نظر دوڑائی اور دبے پاؤں کوٹھے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ رات کے بارہ بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ فیروزہ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اس وقت انیس کو راحت اور سکون دونوں نصیب تھے۔ بالکل اسی طرح کا سکون جو عموماً شدید بارش اور طوفان کے بعد دیکھنے میں آتا ہے۔ انیس اس وقت ایک ایسی دنیا میں تھا جہاں سے فکر و تردد کوسوں دور تھے۔

فیروزہ کی رگ رگ میں شرارت بھری تھی۔ بات بات پر مذاق کرتی اس کے جسم میں ایک موزوں تناسب تھا۔ وہ رہ رہ کر اسے چھیڑتی۔ اس میں زندگی تھی۔ اور وہ دوسروں کے جسم میں بھی زندگی کی لہر پھونک دینا چاہتی تھی۔ وہ خود ہنستی رہتی تھی اور دوسروں کو بھی ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس وقت انیس قنوطی لگا ، ئوں کو نادان سمجھ رہا تھا کیونکہ اس وقت ساری دنیا اسے ہنستی کھیلتی دکھائی دے رہی تھی۔ فیروزہ کے بدن میں ایک لوچ تھا۔ اس میں نزاکت تھی۔ اس میں حسین ادائیں تھیں۔ اس وقت انیس کے جذبات مضطرب ہو رہے تھے۔ فیروزہ میں بھرپور جوانی تھی۔ وہ اپنی جوانی کو بے کار نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ بلکہ وہ اس سے دوسروں کو فیضیاب کرنا چاہتی تھی۔ اس کا چھریرا جسم۔ اس کے نازک چتون انیس کو پریشان کئے دیتے تھے۔ انیس نے فرمائش کی۔ اس نے گانا شروع کیا۔ اس کے گانے میں موسیقیت تھی۔ ترنم تھا۔ اس کے ہر کلام میں شوخی تھی۔ انیس سوچنے لگا کفر ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تیری حضوری شگفتگی خاطر کا سامان نہیں۔ اس وقت سارے رنج والم سوز۔ درد۔ آفت و مصیبت اور اضمحلال سب کچھ اس سے دور تھے۔ بس وہ تھا اور فیروزہ کی دل تسکین باتیں۔ اس وقت امنگیں تھیں تمنائیں تھیں۔ شباب تھا۔ مستی تھی۔ دو جوان دلوں کی بے تابیاں تھیں۔ وہ اس وقت اسے بہت ہی حسین نظر آ رہی تھی۔ انیس نے سوچا اس میں شعر کا کیف ہے۔ شراب کا سکر ہے اور شباب کی مستی ہے" باتیں

اسد حسین ایم۔اے

تضاد

جلسہ ختم ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلدئے۔ انیس بھی خراماں خراماں اپنے گھر کی طرف چل نکلا۔ جلسہ ہندوستان کے فاقہ نصیب انسانوں کی امداد کے سلسلہ میں تھا۔ کافی کامیاب رہا۔ پبلک نے دس ہزار روپے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ خوب ہی پرجوش تقریریں ہوئیں۔ ہندوستان کی اسوقت جو ناگفتہ بہ حالت ہورہی ہے اس کا حال کسے معلوم نہیں۔ ہزاروں آدمی اب تک موت کا شکار بن چکے ہیں۔ کتنے ہسپتال میں ہیں۔ جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ کتنے فٹ پاتھ پر پڑے ہیں تو کتنے ہی ایسے ہیں جو وہیں پڑے دم توڑ رہے ہیں۔ اخبار کے ذریعہ جو تصویریں ہم نے دیکھی ہیں اسکو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ تصویریں تو انسانوں کی ہیں لیکن بدن میں ہڈی اور پسلی کے سوا کچھ نہیں دکھتا۔ اگر ایسے وقت میں بھی ہم ان کی امداد نہ کریں تو پھر کب کریں گے۔ تقریر کی ساری باتیں انیس کے دماغ میں چکر لگا رہی تھیں اور وہ سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ کسی کی نحیف آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے فوراً اپنی بائیں جانب فٹ پاتھ کی طرف مڑ کر دیکھا ایک شخص جس کی عمر چالیس کے قریب ہوگی بوسیدہ کثیف کپڑوں میں ملبوس زمین پر پڑا تھا۔ اس کے کپڑے ناداری و افلاس کا پتہ دے رہے تھے۔ اس کا لاغر اور نحیف جسم۔ اس کی کمزور اور دلگداز آواز اور اس کے لرزتے ہوئے لب ظاہر کر رہے تھے کہ وہ چند دنوں کا مہمان تھا۔ اس کے چہرے اور آواز سے نقاہت عیاں تھی۔ اس کی قوت زائل ہوچکی تھی۔ اس کی آس ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی حسرتوں پر پانی پھر چکا تھا۔ اس کی امنگوں اور تمناؤں کا خون ہو چکا تھا۔ اس کی ہستی پامال ہوچکی تھی۔ اور اب وہ مٹی ہوئی آرزوؤں کا ڈھیر تھا۔ اب اس کے دل سے ایک آہ سنائی دیتی تھی۔ ایک بے قرار آہ جس میں درد پنہاں تھا لیکن اس آہ کا سننے والا کوئی نہ تھا۔ اب اس کے پاس صرف دل کی ایک ویران دنیا رہ گئی تھی۔ اس ویران دنیا میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ جس کے شعلے لوگوں تک پہنچتے تو تھے لیکن ان شعلوں کو بجھانے کی کسی میں تاب نہ تھی۔ اقتصادی مصائب کے ہاتھوں ہزاروں گھرانے تباہ و برباد ہوگئے۔ یقیناً یہ بھی فلاکت و عسرت کا مارا انسان تھا۔ وہ ایک مسافر تھا جو اندھیری رات میں ٹھہر ٹھہر کر سفر کر رہا تھا۔ وہ اب بہت تھک چکا تھا۔ لیکن اس کی منزل اب بہت دور نہ تھی۔ دور سے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس لئے اسے ڈھارس تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھائے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا چہرہ بشاش نظر آنے لگتا تھا۔ چراغ بھی گل ہونے سے پہلے ٹمٹمانے لگتا ہے۔ اور آخری وقت بھڑکنے لگتا ہے۔ ایک تیز روشنی ہوتی ہے پھر بجھ جاتا ہے۔ آفتاب کی آخری کرنیں مدھم پڑنے لگیں تھیں۔ اور دھندلکا ہوچلا تھا۔ انیس کچھ دیر کے لئے اس کے پاس خاموش کھڑا ہوگیا۔ وہ بار بار کچھ کہہ رہا تھا۔ باوجود سخت کوشش کے بھی آواز صاف نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے انیس اتنا سمجھ سکا کہ وہ کئی دنوں کا بھوکا ہے اور کچھ امداد چاہتا ہے یوں تو اس کی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بہت سے الفاظ نکل رہے تھے لیکن "بابو بھوکا" کچھ زیادہ صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کی آواز لمحہ بہ لمحہ دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ انیس کو اس پر بڑا ترس آیا اور اس نے فوراً اپنی جیب کا جائزہ لیا لیکن اس وقت اس کی جیب میں سوائے دس روپے کا نوٹ کے ایک پیسہ بھی ریزگاری کا نہ تھا۔ جس سے وہ اس کی مدد کرتا۔ اپنی مجبوری پر انیس کو افسوس تو ضرور ہوا لیکن کیا کرتا۔ آگے بڑھ گیا اور برابر آگے بڑھتا گیا۔ لیکن وہ مطمئن بالکل نہ رہ سکا۔ اور اس کا خیال اس کے دماغ میں یکساں رقص کرتا رہا۔ اس وقت انیس کو بہت غصہ آرہا تھا۔ بہت ہی انہماک سے سوچنا شروع کیا "کیا کسی کی امداد پیسے دو پیسے آنہ دو آنے تک ہی محدود ہے" کیا کسی کو اس سے زیادہ دینا گناہ ہے۔ کیا اگر میں ایک روپیہ ہی اسے دے دیتا تو کسی گناہ کا مرتکب ہوجاتا لیکن ایک روپیہ میں اسے کیونکر دے سکتا تھا۔ یہ تو اس کے لئے بہت زیادہ تھا اور یقینی وہ ایک روپے کے قابل نہ تھا۔ پھر ممکن ہے ضرورت کے وقت میرے ہی پاس روپے گھٹ جائیں۔ آج کل روپیہ ذرا بچا کر خرچ کرنا چاہئے۔ اب روپے نکالتے وقت ذرا آگے پیچھے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی روپے

۵

میرے پاس کوئی فاضل نہ تھے۔ کس وقت کون سی ضرورت پڑ جائے۔ پھر کس کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔ آج کل کون ایسا ہے جو برے وقتوں میں کسی کے کام آئے۔ ایسی بات ہی کیوں کی جائے۔ جس سے برے وقتوں کا منہ دیکھنا پڑے۔ الغرض یہ ساری باتیں سوچتا ہوا انیس آگے بڑھ گیا۔ پھر بھی اسے اطمینان نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک حساس طبیعت انسان واقع ہوا ہے اور اس نے اکثر اپنے متعلق لوگوں کو یہ رائے پاس کرتے سنا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور چل رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں ایک خیال آیا وہ یہ کہ اگر وہ اپنے سارے جذبات و احساسات کو کاغذ پر سیاہ دھبوں کی شکل میں اتار دے تو وہ افسانہ کی شکل میں یکجا ہو کر خوب ہوں گے۔ اور یہ سوچ کر اسے بہت مسرت حاصل ہوئی۔ لیکن کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک دوسرے ہی خیال نے اسے آگھیرا اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش کھڑا ہو گیا۔ جو خیال اس کے دماغ میں اب آیا وہ یہ تھا " وہ انسان ہی کیا جس پر کسی کی آہ کا اثر نہ ہو۔ وہ انسان ہی کیا کہ کسی کی ٹیس کا اس کے دل میں درد نہ ہو۔ کسی کے درد کا اسے احساس نہ ہو۔ کسی کے آنسو بہنے کا اُسے افسوس نہ ہو۔ زمانے کی کج رفتاری کا تو مجھے رنج نہیں۔ ملک کی زبوں حالی کا مجھے علم نہیں کوئی سڑک پر بھوکوں مر جائے اس کا مجھے غم نہیں بلکہ خوشی ہے تو اس بات کی کہ مجھے ایک اچھا افسانہ ہاتھ آگیا اور اصل اہمیت جو میں نے دی وہ اک اچھا افسانہ مل جانے کو" یہ سب خیال آتے ہی انیس اور زیادہ منہمک ہو کر سوچنے لگا اور اس وقت وہ اپنے سر پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس نے یک بیک چلنا شروع کر دیا۔ اور راستہ میں سارے واقعات آہستہ آہستہ بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر یہ مصرعہ ہلکے ہلکے سروں میں گنگنانے لگا۔

"دو روز کی عمر فانی ہے غم اس میں گوارہ کون کرے"

اب اسے پریشانی کچھ دور ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ طبیعت بشاش معلوم ہونے لگی۔ اضمحلال دور ہوتا دکھائی دیا اور قلب کو سکون ملنے لگا۔ تاریکی کی جگہ اجالے نے لے لی۔

چلتے چلتے اپنی جانب فٹ پاتھ پر فلم "تان سین" کا پوسٹر دیکھنے کھڑا ہو گیا "سہگل اور خورشید" وہ اچھل پڑا۔ ارے یہی دونوں تو "بھگت سورداس" میں بھی تھے۔ خوب ہی گاتے ہیں۔ خاص کر خورشید کا وہ گانا اسے کتنا پسند ہے ؎

"پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے"

نظر اوپر اٹھائی دیکھا فیروزہ حسب معمول کھڑکی پر بیٹھی تھی یوں تو وہ اسے کوئی خاص طور پر پسند نہ تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت وہ اسے بڑی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ فیروزی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے سوچا کیا ہی خوب ہے "فیروزہ فیروزی" طبیعت میں ہیجان پیدا ہوا پہلے اس نے کچھ دیر سوچا پھر فوراً ہی اپنی جیب کا جائزہ لینے لگا۔ سوچا صرف چار ہی روپے تو اس کی فیس ہے۔ کوئی زیادہ بھی نہیں۔ کچھ پان اور سگریٹ میں لگیں گے۔ سڑک پر دونوں جانب ایک تجسس آمیز نظر دوڑائی اور دبے پاؤں کوٹھے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ رات کے بارہ بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ فیروزہ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اس وقت انیس کو راحت اور سکون دونوں نصیب تھے۔ بالکل اسی طرح کا سکون جو عموماً شدید بارش اور طوفان کے بعد دیکھنے میں آتا ہے۔ انیس اس وقت ایک ایسی انوکھی دنیا میں تھا جہاں سے فکر و تردد کوسوں دور تھے۔

فیروزہ کی رگ رگ میں شرارت بھری تھی۔ بات بات پر مذاق کرتی اس کے جسم میں ایک موضوع تناسب تھا۔ وہ رہ رہ کر اسے چھیڑتی۔ اس میں زندگی تھی۔ اور وہ دوسروں کے جسم میں بھی زندگی کی لہر پھونک دینا چاہتی تھی۔ وہ خود ہنستی رہتی تھی اور دوسروں کو بھی ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس وقت انیس قنوطی نگاہوں کو نادان سمجھ رہا تھا کیونکہ اس وقت ساری دنیا اسے ہنستی کھیلتی دکھائی دے رہی تھی۔ فیروزہ کے بدن میں ایک لوچ تھا۔ اس میں نزاکت تھی۔ اس میں حسین ادائیں تھیں۔ اس وقت انیس کے جذبات مضطرب ہو رہے تھے۔ فیروزہ میں بھرپور جوانی تھی۔ وہ اپنی جوانی کو بے کار نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ بلکہ وہ اس سے دوسروں کو فیضیاب کرنا چاہتی تھی۔ اس کا چھریرا جسم۔ اس کے نازک جنون انیس کو پریشان کئے دیتے تھے۔ انیس نے فرمائش کی۔ اس نے گانا شروع کیا۔ اس کے گانے میں موسیقیت تھی۔ ترنم تھا۔ اس کے ہر کلام میں شوخی تھی۔ انیس سوچنے لگا کفر ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تیری حضوری شگفتگی خاطر کا سامان نہیں۔ اس وقت سارے رنج والم سوز۔ درد۔ آفت و مصیبت اور اضمحلال سب کچھ اس سے دور تھے۔ بس وہ تھا اور فیروزہ کی دل شکن باتیں۔ اس وقت امنگیں تھیں تمنائیں تھیں۔ شباب تھا۔ مستی تھی۔ دو جوان دلوں کی بے تابیاں تھیں۔ وہ اس وقت اسے بہت ہی حسین نظر آ رہی تھی۔ انیس نے سوچا اس میں شعر کا کیف ہے۔ شراب کا سکر ہے اور شباب کی مستی ہے" باتیں

آپ کے پسندیدہ ناول

سفینۂ غمِ دل
قرۃ العین حیدر
۶/۰/۰

دُھوپ اور شگوفے
اے حمید
۲/۸/۰

پت جھڑ
احمد ندیم قاسمی
۴/۸/۰

ہوس
عزیز احمد
۲/۰/۰

کال کوٹھری
حمید اختر
۲/۸/۰

مرمر اور خون
عزیز احمد
۱/۸/۰

ایک دل
موپساں
۴/۲/۰

آخری سلام
کرسٹفر اشروڈ
۴/۸/۰

جھیل اور کنول
اے حمید
۳/۰/۰

بھوک
نٹ ہمسن
۳/۸/۰

... اور ڈان بہتا رہا
شولوخوف
۸/۰/۰

ماں
گورکی
۷/۰/۰

قُلی
ملک راج آنند
۶/۰/۰

ڈربے
اے حمید
۳/۰/۰

جب گیت جاگے
کرشن چندر
۲/۱۵/۰

جب بندھن ٹوٹے
تاجور سامری
۳/۰/۰

آدمی اور سکّے
مہندر ناتھ
۳/۱۲/۰

افشاں
اے۔ آر۔ خاتون
۷/۸/۰

یا خُدا
شہاب
۲/۲/۰

ضدی
عصمت چغتائی
۲/۲/۰

گریز
عزیز احمد
۴/۰/۰

فرینڈز بک ڈپو امرتسر

گم کردہ راہ

نثار عزیز

میں دیر سے خاموش اور اداس بیٹھی بادلوں کو دیکھ رہی تھی نیلی نیلی لہریں آہستہ آہستہ میرے نیچے سے گزرے جا رہی تھیں اور میں زندگی کے نامعلوم انجام کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو میں انسان نہ ہوتی۔ آخر مالک نے یہ ہزاروں چیزیں پیدا کی تھیں انہی میں سے ایک مجھے بھی بنا دیتا تو کیا ہوتا۔ قریب سے ایک شکارہ پُرتمکنت انداز سے گزرا "کاش" میں نے سوچا میں اس شکارے کا ایک چپو ہی ہوتی۔ کس بے فکری سے پانی میں داخل ہوتا اور نکلتا ہے" اچانک میری نظر شکارے میں بیٹھی ہوئی ایک حسین لڑکی کے مسکراتے چہرے پر پڑی۔ وہ میرے بجروں تک آتے آتے رک گئی اور میں تیزی سے تختے پر سے اٹھ کر ہاؤس بوٹ کے اندر چلی گئی۔ آخر دنیا میں سب میری طرح مضمحل ہی نہیں تھے۔ مسکراہٹیں بھی تھیں اور شاید مسرت بھی!

رات کے کھانے کے لیے کپڑے بدلتے ہوئے میں نے معمول سے زیادہ دیر لگا دی۔ جانے کیوں آج میری تھکاوٹ مجھے سست بنائے ہوئے تھی اور اس تھکاوٹ کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی۔ سارا دن میں نے سامنے ریسٹورنٹ بوٹ میں سے اترتے چڑھتے لوگوں کو دیکھنے میں گزارا تھا۔ شام کو صرف آدھے گھنٹہ کے لئے شکارے میں جھیل کی سیر کرنے گئی تھی اور بس! — ممکن ہے یہ روح کی تھکن ہو اور ایک مضمحل روح کی تھکن کا مبہم سا اثر۔ سفید سے کنول جیسے پھولوں کا ایک ہار میں نے پہننے کو اٹھایا اور پھر رکھ دیا۔ تین چار دن ہوئے یہ ہار میں غیر ارادی طور پر ایک دوکان سے اٹھا لائی تھی۔ اس وقت رات کے سیاہ اور سفید زردی لباس کے ساتھ یہ ہار یقیناً بھلا معلوم ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے میں اسے پھر اٹھا کر پہننے لگی۔ شیشے میں ہار میں سے نکلتی ہوئی مدھم روشنی کی شعاعوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ جانے اس ہار کو دیکھ کر مجھے ماضی کی کون کون سی باتیں یاد آ جائیں — جب سے اس نئی زندگی میں قدم رکھا تھا اور اپنے شریک زندگی کے خیالات سے واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ تب سے ہر نئی چیز کو پہن کر مجھے پہلا خیال یہی آتا۔ شیشے میں سے جو آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں مایوسی کی جھلک ذرا زیادہ نمایاں تھی۔ کوئی (شاید میرا دل) انہیں کہہ رہا تھا کہ اگر ڈر کی بجائے مجھے یہ امید ہوتی کہ ابھی وہ کہیں گے" البیلی۔ تم اس ہار میں بہت بھلی لگ رہی ہو" تو شاید ان آنکھوں میں مایوسی کی بجائے مسکراہٹ ہوتی — اچانک میری خودی کو ٹھیس لگی — اس امید کو میں کچل کر رہ گئی — کسی سے محبت کی بھیک مانگنے سے پہلے مرجانا بہتر ہے۔ چاہے وہ بھیک صرف خاموش نظروں سے ہی کیوں نہ مانگی گئی ہو۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ کھانے کا بلاوا آیا۔ تو میں ہار پہنے ہوئے ہی کھانے کے کمرے میں چلی گئی

"البیلی بڑی پیاری چیز پہن رکھی ہے" انہوں نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "جی" میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا

اس دن ذرا وہ خوش تھے۔ کھانے کے دوران میں بہت سی باتیں سناتے رہے۔ میں سر جھکائے سنتی رہی۔ کبھی کبھی ایک آدھ لفظ جواباً کہنا پڑ جاتا۔ لیکن انہیں میری خاموشی کا احساس نہ تھا۔ خیر یہ تو اب ایک عادت سی بن گئی تھی۔ ان کی مسلسل گفتگو میری خاموشی! اور میری خاموشی سے ان کی بے نیازی۔ جب پڈنگ آئی تو وہ بڑی تفصیل سے اپنے ماضی کے افسانے سنا رہے تھے" البیلی — آج میں "پریوں کے محل" گیا تھا۔ کیا بتاؤں تمہیں کس قدر رومانوی جگہ ہے۔ میں اور رخسانہ اکثر وہاں جایا کرتے تھے ایک چھوٹے سے درخت تلے بیٹھ کر میں گھنٹوں جھیل کو دیکھتا رہا۔ لہر لہر پر مجھے رخسانہ چلتی ہوئی دکھائی دیتی رہی۔ یقین جانو۔ ایک دفعہ تو میں نے اسے پکڑنے کے لئے بازو پھیلا دیئے۔ یوں محسوس ہوا گویا اس کے پھول سے بدن کو صرف میرے سہارے کی ضرورت ہوگی۔۔۔

وہ بولتے گئے اور میں سنتی گئی۔ آخر وہ آہ بھر کر خاموش ہوگئے اور میں اٹھ کر کھڑکی میں جا بیٹھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب انہیں

بھی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی باتیں وہ مجھے سنا چکے تھے۔

سامنے تخت سلیمان پر چمکتے ہوئے تارے روشنی کے مینار کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی روشنی یاد آگئی۔ آج سے پانچ سال پہلے جب میں حقیقت سے دور۔ تصورات میں گھری ہوئی ایک بے فکر لڑکی تھی تو میں نے اس مینار کو دیکھ کر کتنے ہی پیمان باندھے تھے۔ سوچا تھا اس پہاڑی PROMETHUS کی طرح میں بھی دنیا کو روشن کر دوں گی۔ خود دکھی رہوں یا سکھی ــــ اپنے روتے سسکتے انسانوں کو ضرور سکھ دوں گی۔ اور آج ــ جی چاہا ــ چیخ کر بولنے کی صدا کی طرح فضا میں گم ہو جاؤں! آج میں ساری دنیا تو ایک طرف۔ ایک انسان۔ صرف ایک انسان کو بھی خوش نہیں رکھ سکتی تھی ــــ سامنے بوٹ ریسٹورنٹ میں نیلی اور ارغوانی رنگ کی مدھم بجلیوں کے درمیان میں سے اداس نغموں کا ایک دریا امڈا چلا آتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میرا دماغ چل جائے گا۔ آنسوؤں کی نہ تھم سکنے والی دھاریں دیوانہ وار میرے دامن میں گر رہی تھیں ــ او مالک! اگر جمیل مجھے روتا دیکھ لے ــ تو ــ تو میرا جسم غیر ارادی طور پر کانپ اٹھا تو اسے مجھ پر ترس آئے گا۔ وہ کہے گا "ایلی مجھے تمہارے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ پر..." اور شاید دل میں کہیگا "بڑا افسوس ہے ــــ میں تجھے رخسانہ والی محبت نہیں دے سکتا۔ وہ تو رخسانہ اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئی تھی" اور تب میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ آج تک میں نے جمیل کو اپنے ساتھ اظہار ہمدردی کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ وہ سوچتا تھا ــ جانے وہ کیا سوچتا تھا یہی سوچتا ہوگا کہ میں انسان نہیں۔ میرے سینے میں دل نہیں۔ یا شاید سوچتا ہوگا کہ میں بیوقوف ہوں ــــ کہ اور عورتوں کی طرح ــ اور بیویوں کی طرح اپنی زندگی کو اسے دام میں پھنسانے کے لیئے ایک طویل کشمکش نہیں بنا سکتی۔ ایک دفعہ مجھے اسی طرح کی بات میں نے انہیں نعیم کو بتاتے سنی تھی۔ کہہ رہے تھے "کیا کروں نعیم ــ ایلیس نے کبھی مجھے خوش رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جیسے یا تو اسے کچھ نہ ہو ــ یا جانے کیا بات ہو"

اور میرا دل چیخ پڑنے کو گیا تھا "جمیل کیا میں جادو گرنی ہوں کیا میں کوئی غیر مرئی طاقت ہوں۔ تم نے اپنے آپ کو خاردار جھاڑیوں میں محصور کر رکھا ہوا ہے۔ تمہاری نشست ایک بلند پتھریلی پہاڑی پر ہے اور وہاں بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تم مجھے تصور دار ٹھہرا رہے ہو ــــ کہ میں تم تک پہنچی نہیں۔ کیا کبھی تم نے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کی ــ یا مجھے ہی اپنے تک پہنچنے دیا؟" ــ لیکن تب میں نے کہا کچھ نہیں تھا اپنی کمزوری کا اظہار ــ اپنی شکست کا اعتراف! ــ نہیں کبھی نہیں ــ مردوں سے جو مجھے فطری نفرت تھی وہ ایسے موقعوں پر پھر سے ابھر آتی تھی ــ ریسٹورنٹ بوٹ کے ساز کی لے یکلخت سے بدل گئی ــ ان اداس نغموں کی جگہ ایک اور تھرکتی ہوئی سُر فضا میں پھیلنے لگی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جمیل سونے چلے گئے تھے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ ابھی سوئے نہیں۔ رخسانہ کے خط پڑھیں گے یا پھر کوئی گیت لکھیں گے ــ اس کی یاد میں! اس لئے میں بیٹھی ہی رہی ــ بہتے ہوئے پانی کی طرح گہرائیوں میں اپنی تنہائی چھپائے ہوئے!

عجب بات تھی کہ مجھے رخسانہ سے حسد کبھی نہیں ہوا تھا۔ اگر انہیں اس سے پیار تھا تو پھر کیا ہوا۔ شروع شروع میں ان کے منہ سے رخسانہ کا نام سن کر مجھے عجب سی خلش ہوتی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ لیکن تین سال کی مسلسل باتوں سے میرا دل کچھ بے نیاز سا ہوگیا تھا۔ دل میں کوئی خواہش تھی تو صرف ایک ــ کہ جھیل کے پانی کی طرح ٹھہرا کر میں بھی کسی طرف چل دوں۔ جہاں کوئی بھی نہ ہو ــــ نہ پیار ــ نہ یادیں! نہ ماضی! ہاں ماضی قطعی نہ ہو ــ نہ میرا ٹھکرایا ہوا ماضی! نہ کسی اور ہی کا

تھوڑی ہی دیر میں مجھے ان کے ٹہلنے کی آواز آئی ــ وہ بے چینی سے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ زندگی میں ہزاروں بار میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا "کہیں یہ میرا ہی قصور تو نہیں۔ کہیں میں خود ہی تو اپنی زندگی کو اضمحلال سے بھر دینے کی ذمہ وار نہیں؟" اور ہزاروں ہی بار جواب نفی میں تھا۔ آج سے تین سال پہلے جب میں نے اس زندگی میں قدم رکھا تھا تو مجھے جمیل سے والہانہ پیار ہوگیا تھا۔ اور پیار میں ایک عورت کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ ایک معصوم اور ناواقف دل سے میں نے اپنی زندگی کی تمام تر حقیقتیں اس کے حوالے کر دی تھیں اور اس نے ــــ اس نے مجھے بدلے میں کیا دیا؟ ایک خاموش انکار اور رخسانہ کی محبت کی طویل داستانیں! مانا وہ اس کی بیوی تھی ــ اس کی نوجوانی کی ساتھی! ــ لیکن انہوں نے میری زندگی کیوں برباد کی؟ ــــ میرے احساسات کیوں مجروح کئے ــ میری دنیا

کے پرخچے کیوں اُڑائے۔ مانا کہ وہ مجھے اپنا پیار نہیں دے سکتے تھے لیکن اس حقیقت کے احساس سے تو نجات دلا سکتے تھے۔ انہیں کیا حق تھا۔ کہ وہ مجھے ہر وقت آگاہ کرتے کہ ان کا دل مرحومہ کے ساتھ چلا گیا ہے اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ کیا میری خودی انہوں نے گھر چھوڑ آنے کو کہا تھا۔ نہیں یقیناً نہیں تو پھر کیوں۔ آہ پھر کیوں

ہاتھوں پر سر رکھ کر کتنی دیر میں یہی باتیں سوچتی رہی۔ کسی ہوس بوٹ میں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ شاندر ریکارڈ بج رہا تھا۔ جھیل پر لہریں سرخ قمقموں کی روشنی سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ جمیل تنہا اور خاموش کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے قدم میری برباد زندگی میں چلنے والی سنسان ہواؤں کی طرح مایوس کن تھے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے سر کھڑکی پر رکھ دیا۔ لونگ کے دو تین پیازی پھول میرے بالوں سے مس کر رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں " شاید اب بھی وہ مجھ سے پیار کر سکیں " اور اچانک پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ مجھ سے محبت کریں بھی تو میں ان کا جواب محبت میں نہ دے سکوں گی۔ تین سال کے مسلسل انکار نے میری محبت کے چشمے سکھا دیئے تھے۔ اب اگر کچھ باقی تھا تو وہ مایوسی تھی اور تھکاوٹ اس خیال کے آتے ہی میرے جسم میں ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے تیزی سے کپڑے اتارے اور سونے کی تیاری کرنے لگی " آج سے میں الگ کمرے میں سوؤں گی۔ ابھی ابھی جا کر انہیں کہوں گی۔ جمیل مجھے معلوم ہے۔ تمہیں میری موجودگی سے راحت نہیں۔ لیکن آج تک میں جانے کیوں تمہارے لئے بوجھ بنی رہی۔ شاید اپنے دل کی خاطر! آج میں تمہیں آسانی سے چھوڑ سکتی ہوں کیونکہ مجھے اب تم سے محبت نہیں رہی۔ شاید وہ آدمی باتیں سنے ہی نہیں۔ یقیناً نہیں سنے گا۔ بہتر ہو کہ میں اسے یہی کہوں۔ " جمیل آج سے میں اپنے کمرے میں رہوں گی "

شب خوابی کا لباس درست کرتے ہوئے میں سونے کے کمرے میں گئی۔ جمیل عجب پیار کی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ٹھٹھک گئی۔ " جمیل " میں نے بات شروع کی " ایلی " انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے تمہارا انتظار تھا اور پہلی ہی مرتبہ تم نے اتنی دیر کی۔ " ایلی " انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ میں پیچھے ہٹ گئی ——— پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا۔ کہ تین سال کی بے اعتنائی نے مجھے کس قدر سخت کر دیا تھا

" جمیل تمہاری ایلی پہلی مرتبہ بہت دیر سے آئی ہے۔ شاید اب تمہیں ساری عمر میرا انتظار کرنا پڑے "

(ختم شد)

خلیل جبران

مترجم: حبیب اشعر

خواب

جب رات سیاہ ہوئی اور نیند نے اپنی چادر زمین پر پھیلا دی تو میں اپنے بستر سے اٹھا اور سمندر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ سارے راستے میں اپنے دل میں کہتا گیا۔

"سمندر کبھی نہیں سوتا اور اس کی بیداری بے چین دل کے لئے وجہ تسلی ہے"

میں ساحل پر پہنچا۔ بادل پہاڑوں کی بلندی سے اتر کر گرد و پیش کی فضا پر چھا گئے تھے۔ جیسے کسی حسین دوشیزہ کے چہرہ پر خاکستری نقاب!

میں ٹھہر گیا اور فوج در فوج موجوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا میرے کان ان کے نغمات عبودیت سن رہے تھے اور ذہن ان مافوق قوتوں پر غور کر رہا تھا۔ جو ان کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں —— وہ قوتیں جو طوفان کے ساتھ ابھرتی، آتش فشاں پہاڑوں کے ساتھ پھٹتی، پھولوں کے ساتھ مسکراتی اور لہروں کے ساتھ گنگناتی ہیں

تھوڑی دیر کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ قریب کی ایک چٹان پر تین سائے بیٹھے تھے۔ جنہیں بادلوں کے لطیف پردے چھپا بھی رہے تھے اور نہیں بھی چھپا رہے تھے۔

میں آہستہ آہستہ ان کی طرف چلا۔ گویا ان کے وجود میں ایک طلسمی قوت تھی۔ جو میرے ارادہ کے خلاف مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

دو چار قدم چل کر میں ٹھہر گیا اور انہیں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ گویا اس جگہ کوئی جادو تھا۔ جس نے میرے ارادہ کو سلب اور روحانی تصورات کو بیدار کر دیا تھا۔

اس وقت ایک سایہ کھڑا ہوا اور ایسی آواز میں جو معلوم ہوتا تھا۔ کہ سمندر کی گہرائیوں سے آ رہی ہے۔ اس نے کہا۔

"زندگی بغیر محبت کے ایسی ہے جیسے درخت۔ جس میں نہ پھول ہوں نہ پھل! اور محبت بغیر حسن کے ایسی ہے جیسے پھول۔ جس میں خوشبو نہ ہو۔ اور پھل جن میں بیج نہ ہوں۔...... زندگی محبت اور حسن —— ایک مستقل ذات کے تین جوہر ہیں —— وہ مستقل ذات جو تغیر و انفصال کے اثر سے بالکل آزاد ہے"

یہ کہا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا

اس کے بعد دوسرا سایہ کھڑا ہوا اور ایسی آواز میں جو اچھلتے پانی کی گڑگڑاہٹ سے ملتی جلتی تھی۔ اس نے کہا

"زندگی بغیر بغاوت کے ایسی ہے، جیسے موسم بغیر بہار کے اور بغاوت بغیر صداقت کے ایسی ہے، جیسے بہار، صحرائے بے آب و گیاہ میں!...... زندگی، بغاوت اور صداقت —— ایک ذات کے تین جوہر ہیں —— وہ ذات، جو تغیر و انفصال سے ماوراء ہے!!"

اس کے بعد تیسرا سایہ کھڑا ہوا، اور ایسی آواز میں جو بجلی کی کڑک سے مشابہ تھی، اس نے کہا،

"زندگی بغیر آزادی کے ایسی ہے جیسے جسم جس میں روح نہ ہو اور آزادی بغیر فکر کے ایسی ہے جیسے روح۔ جو بھٹکی ہوئی ہو، آزادی اور فکر ایک ازلی ذات کے تین جوہر ہیں وہ ازلی ذات جو زوال و فنا سے مطلقاً پاک ہے!!"

اس کے بعد تینوں سائے کھڑے ہوئے اور ڈراؤنی آواز میں ایک ساتھ کہنے لگے

"محبت اور اس کی تخلیقات، بغاوت اور اس کے لوازمات آزادی اور اس کے متعلقات —— اللہ کے تین مظاہر ہیں اور اللہ دنیائے فکر و نظر کا دل ہے!!"

ماحول پر سکوت طاری ہو گیا، جو غیر محسوس پروں کی سرسراہٹ اور فضائی ذرات کے تموج سے لبریز تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور سنی ہوئی باتوں کی صدائے بازگشت سننے لگا۔

لیکن جب میں نے آنکھیں کھولیں اور دوبارہ دیکھا۔ تو سطح سمندر پر تیرتے ہوئے بادلوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا

میں اس چٹان کے قریب گیا جہاں تینوں سائے بیٹھے تھے لیکن وہاں کی طرف آسمان تک اٹھتے ہوئے دھوئیں کے سوائے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

تلوک چند محروم

متفرقات

اشعار

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو کیسے اے ہمنوا! جب نہ ہو شاخِ چمن سے گلفشانی کی امید

وائے قسمت ہو گئے صیاد اور گلچین وہی جن سے تھی اہلِ چمن کو باغبانی کی امید

ساغرِ صہبائے رنگیں پر لپکتے ہیں حریف ہم کو ساقی سے نہیں اک گھونٹ پانی کی امید

رُباعی

یہ ملک تھا پاک آتماؤں کا وطن یا دیویوں اور دیوتاؤں کا وطن

مغرب کی پیروی سے رفتہ رفتہ بنتا گیا خوبرو بلاؤں کا وطن؛

دیگر

خاکسترِ زیست میں شرر باقی ہے ہر چند ہے افسردہ، مگر باقی ہے

گزری شبِ غفلتِ جوانی، لیکن، آنکھوں میں نیند کا اثر باقی ہے

شکیل الرحمٰن

تاج محل

(ایک تمثیلی نظم)

(ساحر لدھیانوی کے نام ـــــ محبّت اور معذرت کے ساتھ)

کردار:- آواز

شاعر

ایک تاریک سایہ

(چاندنی رات میں تاج محل کے قریب ایک آواز ـــ ایک بھاری آواز)

آواز:-
دُودھ میں غسل فرشتوں نے کیا تھا جا کر
تب کہیں جا کے امنگوں میں مہک آئی تھی
برف جنّت سے ہتھیلی میں لئے آئے تھے
پھر نئے کیف سے دنیا میں چمک آئی تھی

(شاعر تاج محل کے قریب آتا ہے)

شاعر:-
ایک دوشیزہ اٹھی رات کا آنچل چھوٹے
اور اک دودھ کے دریا میں لگا دی ہے چھلانگ
شبنمی عارض پہ سُرخ گلابوں کا جمال
کہکشاں سے بھر لی ہے پیکرِ ناز نے مانگ

یہ دریچے، یہ ستوں اور منقش دیوار
میری محبوب کے گیسو کی گھٹا ہو جیسے
طاق رنگیں پہ مچلتی ہے، جھکتی محراب
احمریں عارض پر کوئی جھکا ہو جیسے

تاج کی طاق سے ہونٹوں کی مہک آتی ہے
اور محراب پہ باہوں کا گماں ہوتا ہے
صندلی جسم کے سائے اب بھی اٹھتے ہیں
اب بھی دیوار سے سانسوں کا دھواں اٹھتا ہے

پنڈی امرتسر

سادگی تاج محل کی، جیسے جلتے ہوں
محراب میں نرم تبسم کے دیئے بچوں کے
چاندنی تاج محل پر ایسی لگتی ہے
دل کے عارض پہ محبت کی نگاہیں جیسے

ہائے تاریخ کے گاتے وہ گلابی لمحے
جن کے سائے میں حسیں قسم کسی نے کھائی
وہ شہنشاہ ہمیں یاد رہے گا ہر دم
جس کے وعدے سے نئی چیز زمیں پر آئی

آج ممتاز ہیں جس کے گلابی عارض
اک شہنشاہ کے احساس نے بڑھکر چوما
عنبریں بال پہ ادراک نہیں پا سکتے
جن کے سائے میں حسیں تاج کا نقشہ جاگا

{دریائے جمنا کی لہریں تیز ہو جاتی ہیں اور ایک دھواں سا اٹھنے لگتا ہے اِس دھوئیں سے ایک انسان کا سایہ نکلتا ہے اور شاعر کے قریب آ جاتا ہے}

تاریک سایہ :-

آج شاعر تجھ کو رقصِ حسیں سے پہلے
اپنے سپنوں کے جزیروں سے نکل آنا تھا
آج تخلیق کے کھنڈر میں اُتر کر تجھ کو
آج تخلیق کے ہر راز کو پا جانا تھا

نامکمل یہ عمارت، یہ ادھورا سپنا
ان میں تم دیکھ بھی سکتے تھے تمنا کے داغ
کاش محراب کے سائے میں محبت کے نقوش
آج احساس کی سرحد پہ جلا دیتے چراغ
اپنے رنگین تصور کو سجا لینے سے
تاج کے ماتھے شکن دور نہیں کر سکتے
اک شہنشاہ کی غفلت کے سہارے ہرگز
میری محنت کی تھکن دور نہیں کر سکتے

میری محنت اک مزدور کی سچی محنت
جس سے بت جاگ اٹھے اپنے صنم خانے کے
طاق محراب یہ گنبد یہ ستونوں کا وقار
تاج پر رقص میں کچھ خواب میں دیوانے کے
آج اسرار محبت کے سبھی کھل جاتے
اجنبی تاج کی راہوں کو بھی دیکھا ہوتا
صرف ممتاز کی باہوں سے بہتے طلے
تاج میں ناز کی باہوں کو بھی دیکھا ہوتا
نازِ محبوب مری جس کی حسیں آنکھوں سے
تاج کا حسن لیا، تاج کی عظمت لے لی
اور پتھر میں سمو کر یہ عنایت اس کی
تاج کو حسن دیا، تاج کو عظمت دے دی
عنبریں بال پریشان تھے جب بھی اسکے
ان ستونوں پہ سرِ عام شکن آتی تھی
مسکراتی تھی مرے جسم پہ بازو رکھ کر
اور اس گنبد پہ شوخ کرن آتی تھی
چاندنی رات میں گاتی تھی کبھی جو آکر
میرے احساس میں اک چاند پگھل جاتا تھا
اک وحشی کا سنبھلتا تھا تڑپتا جو شعور
سنگِ مرمر میں وہی چاند اتر آتا تھا
ایک دن شور ہوا ڈوب گئی جمنا میں
میری محبوب! جلائے تھے دیئے سب جس نے
دشت تنہائی کی اس رات میں اٹھ کر میں نے
آخری اینٹ رکھی تاج کی ان ہاتھوں سے
اور اس روز سے یہ تاج محل زندہ ہے
اور اس روز سے جلتے ہیں محبت کے چراغ
نامکمل یہ عمارت، یہ ادھورا سپنا
انہیں سب دیکھ بھی سکتے ہیں تمناؤں کے داغ

نامکمل یہ عمارت، یہ ادھورا سپنا
اک تمدن کی یہ تخلیق محبت کی شراب

محمد صفدر

اس کی ہر اینٹ پہ اٹھتے ہیں ہوا سے شاعر
اک تمدن کے حسیں سائے محبت کے گلاب
تم سشہنشاہ کی اُلفت کو کرو ہنس کے سلام
آج مزدور کی محنت کو مگر مت بھولو
ایک تہذیب کی تخلیق میں شامل سب ہیں
آج مزدور کا تم خونِ جگر مت بھولو

{ تاریک سایہ جمنا کی لہروں میں ڈوب جاتا ہے اور شاعر تاج محل کو چاندنی رات میں بہت غور سے دیکھنے لگتا ہے }

اظہار ملیح آبادی

ادب برائے زندگی

حقیقت میں بے رنگ و بے نور ہے ادب زندگی سے اگر دور ہے

ادب کیا ہے آئینہ دارِ حیات ادب کیا ہے پروردگارِ حیات

ادب کیا ہے میزانِ ہر خشک و تر ادب کیا ہے تجزیۂ خیر و شر

ادب کیا ہے عکاسیٔ رنگ و بو ادب کیا ہے نباضیٔ زشت و خو

ادب کیا ہے روحِ روانِ خروش ادب کیا ہے نقادِ امروز و دوش

ادب کیا ہے انسانیت کا چراغ ادب کیا ہے عقل و خرد کا دماغ

ادب کیا ہے تخلیقِ مہر و نجوم ادب کیا ہے گنجینہ ہائے علوم

ادب کیا ہے آوازِ سازِ حیات ادب کیا ہے خونِ دلِ کائنات

ادب کیا ہے قلبِ محبت کی آگ ادب کیا ہے انسانیت کا سہاگ

ادب کیا ہے ذرّوں کی رخشندگی ادب کیا ہے انسان کی بندگی

ادب ہر زمانے کی تفسیر ہے ادب ابنِ آدم کی تقدیر ہے

ادب سے ہے قوموں کو پائندگی ادب ہے وہی جس میں ہو زندگی

نہیں اس کا اندیشہ کچھ بھی کہو مگر یہ ضروری ہے اے دوستو

ہر اک بات کہنے کا ڈھب چاہیئے — ادب کی زباں میں ادب چاہیئے

ہر اک کو لازم ہے موزوں لباس — کہ جیسے نہاں قند میں ہے مٹھاس

تڑپ جس طرح نوجوانی میں ہے — خروش و سکوں جیسے پانی میں ہے

ستاروں میں جس طرح ہے روشنی — شراروں میں جسطرح ہے سنسنی

رگِ گل میں ہے جسطرح رنگ و بو — دلِ خاک میں جیسے ذوقِ نمو

اگر حسن آنکھیں ملاتا نہیں — کسی شے پہ رنگ آتا نہیں

ادب کی زباں میں شرارہ بھی برف — ادب کی زباں میں خموشی بھی حرف

اگر ان حقائق سے بیزار ہو — تو تم سخت کج فہم معمار ہو

عمارت کی بنیاد سب کچھ نہیں — نہ جب تک ہو دیوار و در دلنشیں

عمارت کو اپنی بناتے چلو

مگر پتھروں کو سجاتے چلو

ستیہ پال آنند

اُبال

آج پھر سینۂ صد چاک سے اُٹھتا ہے دھُواں
آج پھر حدّتِ احساس بڑھی جاتی ہے
مُدّتوں بعد مرے دل میں اُبال آیا ہے
کوئی تدبیر کروں — کوئی سہارا ڈھونڈوں

•

کون کہہ سکتا تھا، اک روز مرے گیت کی لے
وقت کے شورِ سلاسل سے اُلجھ جائے گی
پپڑیاں توڑ کے ہونٹوں سے لہو اُمڈے گا
اور لہرائیں گے پلکوں پہ فسردہ تارے

•

ہائے وُہ وقت کہ احساس کی پہنائی میں!
پھول ہی پھول کھِلے جاتے تھے تا حدِ نظر
تتلیاں نرم ہواؤں میں بہی جاتی تھیں
خود بخود جھانجریں بیدار ہوئی جاتی تھیں
کلیاں کھِلتی تھیں، شگوفوں پہ نکھار آیا تھا
اجنبی ہاتھوں سے واقف نہ تھی گلشن کی بہار

•

کون کہہ سکتا تھا اُس وقت کہ آخر اک دن
میرے ادراک کی بے داغ حسیں چادر پر
یوں بکھر جائیگی احساس شکن دھندلاہٹ
جیسے چھا جائیں کسی جھیل پہ گہرے سائے

•

پھر بھی ہوں منتظرِ وعدۂ فردا اب تک
سوئے در ہے نگراں چشمِ تماشا اب تک

میلا رام وفا

○

نگی خاک میں بھی تھی ترے دیوانے سے
اب نہ اٹھے گا بگولہ کوئی ویرانے سے
ں قدر ہو گئی کثرت ترے دیوانوں کی
قیس گھبرا کے چلا شہر کو ویرانے سے
سی کی بیگانہ وشی سے یہ تغیر آیا!
کہ اب اپنے بھی نظر آتے ہیں بیگانے سے
خ صاحب بھی ہوئے معتقدِ پیرِ مغاں
آج یہ تازہ خبر آئی ہے میخانے سے
مرا آگ محبت کی اسے کہتے ہیں
جلنا دیکھا نہ گیا شمع کا پروانے سے
نی تو ہین نہ کر میری بلانوشی کی
ساقیا مجھ کو نہ دے ماپ کے پیمانے سے
ے وفا اپنے بھی جب آنکھ چرا لیتے ہیں
بے رخی کا ہو گلہ کیا کسی بیگانے سے

حسن نعیم

○

تسکینِ دل کی بات مِرے دل سے پوچھئے
جو رہگذر کی بات ہو، منزل سے پوچھئے
قطروں کے اضطراب سے موجیں ہیں باخبر
طوفاں کہاں کہاں ہے، یہ ساحل سے پوچھئے
کس کس طرح سے وار سنبھالے کئے ہیں ہم
یہ بات جاکے آپ ہی، قاتل سے پوچھئے
اپنی ہی سادگی پہ ہنسا کیوں تمام شب!
یہ ماجرائے ہجر، نسیم دل سے پوچھئے
میں کچھ سمجھ کے خوش ہوں، وہ صیاد بھی ہے خوش
ہے کس کے پاؤں میں یہ سلاسل سے پوچھئے
ہر لمحہ جل رہا تھا چراغِ وفا مگر
گذری ہے کیسے رات، مرے دل سے پوچھئے
کیوں انتظارِ صبح میں بے چین ہے نعیم
اسکے علاوہ اور بھی بسمل سے پوچھئے

موہن سنگھ ہنر

ترے دل کو وفا نا آشنا کہنا ہی پڑتا ہے
بجا جو بات ہو اُس کو بجا کہنا ہی پڑتا ہے

گذارش برق سے وہ بھی نشیمن کے تحفظ کی!
کبھی دشمن سے اپنا مدعا کہنا ہی پڑتا ہے

دلِ پُر درد میں جب ضبط کا یارا نہیں رہتا
تو پھر سب کچھ روا نا روا کہنا ہی پڑتا ہے

دیارِ عشق میں آتے ہیں ایسے بھی مقام اکثر
جہاں تیرے کرم کو بھی جفا کہنا ہی پڑتا ہے

کریں تو کیا کریں مارا ہمیں شرمِ محبت نے
کسی نا آشنا کو آشنا کہنا ہی پڑتا ہے

پتہ آغاز میں دیتی ہے جو انجام کا ہم کو
اُسی دھڑکن کو آوازِ خدا کہنا ہی پڑتا ہے

نہ ہو جب درد کو صحت نوازش ہائے پیہم سے
بالآخر اُس کو دردِ لا دوا کہنا ہی پڑتا ہے

بنایا انقلاباتِ جہاں نے کیا سے کیا ہم کو
ہماری ابتدا کو انتہا کہنا ہی پڑتا ہے

فضائے عشق سے باہر کہیں پائی نہیں جاتی
وہ دُنیا جس میں بندے کو خدا کہنا ہی پڑتا ہے

ہُنر اک رند ہے رہتا بھی ہے رندوں کی صحبت میں
مگر وہ رند جس کو پارسا کہنا ہی پڑتا ہے

عرش صہبائی

○

لے کر ترے غموں کا سہارا کبھی کبھی
تنہائیوں میں وقت گذارا کبھی کبھی

جب منزلِ حیات پہ ہم تھک گئے ندیم
آیا لبوں پہ نام تمہارا کبھی کبھی

کشتی کو لے ڈبوئے ہیں کشتی کے ناخدا
طوفاں ہی دے گئے ہیں سہارا کبھی کبھی

قلبِ حزیں نے درد کے عالم میں ڈوب کر
بے اختیار تجھ کو پکارا کبھی کبھی

جب گردشِ ایام ہو ناسازگار عرش
دیتا ہے دل کو جام سہارا کبھی کبھی

سروش کشمیری

○

دیکھ کر میرے آشیانے کو
بجلیاں آتی ہیں جلانے کو

دو گھڑی اپنا غم بھلانے کو
ڈھونڈتا ہوں شراب خانے کو

جھکنا ہوگا ہمارے قدموں پر
آخرش ایک دن زمانے کو

چوٹ کھانے سے پیار ہوتا ہے
پیار کہتے ہیں چوٹ کھانے کو

تری آنکھوں میں ڈوب کر ساقی
کون ڈھونڈے شراب خانے کو

آہ! بلبل نے اپنی آہوں سے
پھونک ڈالا ہے آشیانے کو

یاد کرنے سے کیا ملیگا سروش
بھولے بسرے ہوئے فسانے کو

۹ ادیب شاہ پوری

تری نظروں سے نظروں کو ملایا جا نہیں سکتا
نشانہ برق کی زد پر لگایا جا نہیں سکتا

مجھے اے ڈوبنے والے ستارو ساتھ لے ڈوبو
سحر ہونے کو ہے، اب اُن سے آیا جا نہیں سکتا

محبت بحرِ بے پایاں بھی ہے، پایاب بھی ہمدم
مگر ساحل سے اندازہ لگایا جا نہیں سکتا

نہ چھیڑ افسانۂ گل، عندلیب زار رہنے دے
کہ صحرا میں چمن کا حسن پایا جا نہیں سکتا

اتارو بادباں، یا ناخداؤں کو بدل ڈالو
مگر کشتی کو طوفاں سے بچایا جا نہیں سکتا

یہ گلہائے تبسم اور بزمِ غیر کیا معنی؟
ہماری قبر پر کیا مسکرایا جا نہیں سکتا

جنابِ شیخ نے کچھ اس طرح بدلا ہے ایماں کو
کہ اب ایمان پر ایمان لایا جا نہیں سکتا

کچھ ایسی وارداتیں بھی ہمارے دل پہ گذری ہیں
کہ جن کا سلسلہ تم سے ملایا جا نہیں سکتا

نہ بھول اے واعظِ ناداں یہ اک واضح حقیقت ہے
کہ مستقبل کا حل ماضی میں پایا جا نہیں سکتا

[illegible]
تمہارا نام، تم کو بھی بتایا جا نہیں سکتا

[illegible] ادیب اکثر
حریمِ ناز میں لیکن بلایا جا نہیں سکتا

جاوید قمر

گیت

یہ چندا، یہ جھلمل کرتے چنچل تارے سارے
سارے روپ تمہارے
تم بھی سندر یہ بھی سندر
تم من موہن پیارے
تم سب ایک لڑی کے موتی اِک نگری کے باسی

تم سب دور ہی دور سے ہنس کر پاس بلانے والے
تم سب ایک جھلک دکھلا کر پھر چھپ جانے والے
تم سب گورے مکھڑوں والے اور من کے سب کالے ——— تم سب من کے کالے

یہ چندا، یہ جھلمل کرتے بیکل تارے، سارے
سارے روپ ہمارے
ہم بھی بیکل، یہ بھی بیکل
ہم دکھیا بے چارے
ہم سب ایک ہی نین کے نیر ہیں۔ اک نگری کے باسی

ہم سب دکھیا رین نگر میں باتیں کرنے والے
ہم سب چھپ چھپ مل کر آہیں بھرنے والے
ہم سب ساتھی، پریم پجاری اور سب ہیں متوالے ——— ہم سب ہیں متوالے

[illegible] نے بہت سے نئے تجربات کو جنم دیا ہے۔ اور موجودہ دور میں جبکہ اردو زبان [illegible] سے دوچار ہے [illegible]
[illegible] کام نہیں۔ شاید آپ اسے کامیاب بنانا ہے۔ لہٰذا ان حالات کے تحت میرے [illegible]
[illegible] بات نہ تھی۔

مگر پرسوں کی ڈاک سے جب "پگڈنڈی" کے دو پرچے موصول ہوئے تو لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ [illegible] کی گود میں سمٹ گئی اور مجھے محسوس ہوا۔ جیسے پگڈنڈی کی شکل میں نے اپنا مقصد آپ پا لیا ہو۔

"پگڈنڈی" ملا ——— تو دیر تک میں اس کے پیچ و خم میں کھویا رہا۔ کبھی کبھی نظروں سے اس کے نشیب و فراز کو ٹٹولتا رہا اور پھر اچانک ایسا لگا کہ جیسے اسی اچھی ہوئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی کے تھوڑی دور پرے آرزو و طلب کی درخشندہ منزل مسکرا رہی ہے۔ وہ منزل ——— جس کی تلاش میں اردو کے کچھ ادیب تو مایوس ہو چکے ہیں اور کچھ اپنے آپ کو اجنبی نظروں سے گھور رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ کہ اب رک جائیں ؟ ——— اداسی۔ غلط فہمی اور ناکامی کے گھٹ ٹوپ اندھیرے میں "پگڈنڈی" ایک ایسی کہکشاں کا روپ لے کر ابھری ہے کہ جس کی ہنسی منزل تک پہنچنے کا نشاط آگیں پیغام دے رہی ہیں۔

پگڈنڈی ——— اور ——— رہبر ——— جہاں دونوں چیزیں موجود ہوں وہاں بھٹکنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ آپ منزل کی جانب بڑھنے کا قافلہ کو پوری طاقت سے منظم کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیے۔ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا اور میری نیک دعائیں آپ کا ساتھ دیں گی۔

آپ کے حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔ لہٰذا "پگڈنڈی" کے لئے عنقریب کوئی چیز بھیجوں گا ——— "خورشید" کا پہلا شمارہ دسمبر کے پہلے ہفتے تک چھپ جائے گا۔ تعاون کی پیش کش کا شکریہ ——— !

میں ان دنوں اپنا پہلا مجموعہ ترتیب دے رہا ہوں اور اس سلسلہ میں بھی آپ کی معاونت کا متمنی ہوں ——— میرے لئے اور کوئی خدمت

مخلص کار
پریم وار برٹنی

اقبال گنج لدھیانہ
۱۱ر نومبر ۱۹۵۳ء

برادرم، خلوص و شوق !

پگڈنڈی کا تازہ شمارہ موصول ہوا ——— شکریہ !

آپ کی ہمت قابلِ داد ہے کہ پنجاب جیسی ادبی سنگلاخ زمین سے آپ نے ایک ہرے بھرے کومل پودے کی پرورش شروع کی ہے بحرانی دور میں کسی صاف ستھرے ترقی پسند پرچے کو جاری کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے عزم اور محنت کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ صحت مند۔ ترقی پسند اقدار کا سہارا لے کر آگے بڑھتے رہیں گے ——— اپنی ایک غیر مطبوعہ نظم بھیج رہا ہوں۔

نیاز آگیں
ستیہ پال آنند

کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ
یکم دسمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی آداب

پرچہ اور خط دونوں ملے۔ اس نوازش کا شکریہ۔ آج کل دورے پر ہوں۔ کچھ روز اور مہلت دیجئے۔ میں "پگڈنڈی" کو دو ایک

[illegible] ۔ آپ کے [illegible] ہوں گے

آپ کا
[illegible]

[illegible]
دسمبر [illegible]

مکرمی ۔ تسلیم

آپ کا خط اور رسالہ موصول ہوا ۔ شکریہ ۔ آپ نے جس جرأت سے کام لے کر ایسا معیاری رسالہ نکالا ہے وہ قابلِ ستائش [illegible] معیاری رسالہ نکالنا آج کل جوئے شیر لانا ہے اور آپ اس میں بالکل کامیاب ہیں ۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی خدمت میں کچھ ارسال کرتا رہوں ۔ فی الحال ایک نظم حاضر ہے
آمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے

خلوص کار
منیر احمد شوقی

[illegible]
۳ر دسمبر ۱۹۵۳ء

پیارے بھائی تسلیمات

"پگڈنڈی" پہنچا ۔ شکریہ ۔ اس کے دوبارہ اجرا سے مسرت ہوئی ۔ آمید ہے کہ آپ ایسے سحر نگار ادیب کی ادارت میں یہ پرچہ روز افزوں ترقی کرے گا ۔

پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ "پگڈنڈی" دوسرے پرچوں سے کم مرتبہ نہیں رکھتا ۔ بلکہ بیشتر پرچوں سے بلند ہے ۔ اس ہنگامی دور میں اردو ادب کے لئے آپ کی یہ سعی و کوشش لائقِ داد ہے ۔ زیادہ اظہارِ خلوص

آپ کا مخلص
پورن سنگھ ہنر

پورنیا کالج پورنیا
۲ر دسمبر ۱۹۵۳ء

محترمی ۔ تسلیم !

آپ کا کارڈ مل گیا مگر رسالہ نہیں ملا ۔ یقیناً ڈاک کے شوقینوں کی نذر ہو گیا ہوگا ۔
ویسے "پگڈنڈی" کا ایک آدھ شمارہ میں نے رانچی میں دیکھا تھا ۔ آج کل سستے پرچوں کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ ہے ۔ فحش لٹریچر ایک سیلاب ہے جو ہماری تمام تہذیبی پاکیزگی اور پرتا کو ڈبوئے دے رہا ہے ۔ اس لئے "پگڈنڈی" کا ایک یہ بھی فرض ہونا چاہئے اس سے جنگ کرے اور شکست دے ۔ میں اسے کوئی معمولی بات نہیں سمجھتا کہ اس کو کوئی اہمیت نہ دی جائے ۔ یہ ہماری [illegible] کا ایک اہم مسئلہ ہے اور [illegible] [illegible] کا جواب دینا ہے کہ وہ کب تک اس کو گوارا کر سکتے ہیں
آپ کی فرمائش [illegible] [illegible] کوشش کروں گا

[illegible]
[illegible]

چونڈی امرتسر

شعری ادب

نقش فریادی — فیض

جلال و جمال — ندیم

تلخیاں — ساحر

گجر — قتیل

شعلۂ طور — جگر

دست صبا — فیض

خرابات — عدم

جلترنگ — قتیل

گردش جام — عدم

ترنجن — واہی

تاریک سیارہ — اختر

خم کاکل — سیف

پیچ و خم — عدم

رم جھم — ندیم

قول و قرار — عدم

آہٹیں — شاد

فروزاں — جذبی

آہنگ — مجاز

[illegible]

شعر ساز [illegible]

غزل — مجروح

افسانوی ادب

تین غنڈے — کرشن چندر

پبلک سیفٹی ریزر — ابراہیم جلیس

کچھ یادیں کچھ آنسو — اے حمید

ورق ورق — ظ انصاری

شکست کے بعد — کرشن چندر

خزاں کا گیت — اے حمید

یزید — منٹو

طلوع و غروب — ندیم

نمرود کی خدائی — منٹو

منزل منزل — اے حمید

سناٹا — ندیم

اسمارائیں — ممتاز مفتی

میں کون ہوں — خواجہ احمد عباس

کوکھ جلی — راجندر سنگھ بیدی

قصر ناتمام — عزیز احمد

پھند — منٹو

کالا چور — ابراہیم جلیس

کونپل — اپندرناتھ اشک

بگولے — ندیم

ان داتا — کرشن چندر

ایک بات — عصمت

[illegible]

فرینڈز بک ڈپو امرتسر

دارا

اداکار:- شیخ مختار۔ بیگم پارہ۔ نکری۔ انصاری۔ نگار سلطانہ

میوزک:- محمد شفیع

پروڈیوسر:- شیخ مختار

ہدایت کار:- ہریش

پیشکردہ:- عمر خیام فلمز لمیٹڈ

دارا عمر خیام کی ایک قابل برداشت فلم ہے۔ قابل برداشت میں نے اس لئے کہہ دیا ہے۔ کہ اس میں ہنسی مذاق ہے۔ گو وہ بھدے بھونڈے اور بے ڈھنگے پن سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ فلم دارا بنانے کا مقصد کیا ہے تو کہانی کار، دار ہدایت کار شیخ مختار اور بیگم پارا کے کردار کو پیش کرتے کرتے اپنے مقصد سے ہٹ کر ان کی ایکٹنگ میں ہی الجھ کر رہ گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی فلم کا آغاز بہت اچھا تھا

بجو (شیخ مختار) ایک دیہاتی سیدھا سادا نوجوان جس کا آدرش اپنا گاؤں اور اس کے کھیتوں کی حفاظت کرنا ہے ایک مورتی کے سامنے پرتگیا کرتا ہے کہ جب تک وہ اپنے آدرش کو پورا نہ کریگا۔ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ سب دیہاتی اس آدرش میں اس کے ساتھ ہیں۔ مگر اس دوران میں دارا (انصاری) کا ایک ساتھی رامو جو کہ اسی گاؤں کا باشندہ ہے۔ اور گاؤں سے غداری کر کے ٹھاکر دیوی سنگھ (جو کہ ایک زمیندار ہے مگر درپردہ وہ اکثر ڈاکے بھی ڈالتا رہتا ہے۔ اور ایسی وارداتوں سے اس سے اکثر قتل بھی ہو جاتے ہیں) سے جا ملا ہے۔ بجو کی [illegible] تبدیل کر کے بجو کو دارا ظاہر کرتا ہے اور بجو اپنی گرفتاری سے بچنے کے لئے پولیس کے ڈر سے بھاگ نکلتا ہے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے سمندر میں

بھی کود جانا پڑتا ہے۔ جس سے وہ ایک سٹیمر کا سہارا لیتا ہے اور سٹیمر بمبئی کے ذریعے اور پہنچ جاتا ہے۔ مگر اس سٹیمر میں بھی پولیس کو یہ اعلان کرتے ہوئے (دارا ڈاکو بھاگ نکلا ہے۔ اس کا حلیہ حسب ذیل ہے) دیکھ کر وہ ایک کمرے میں چھپنے کی غرض سے داخل ہوتا ہے۔ پولیس کی گولی سے زخمی ہونے کی وجہ سے اسے آرام کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر جب کمرے میں کم کم (نگار سلطانہ) شور مچاتی ہے۔ تو یہ اس سے التجا کرتا ہے کہ میں بے قصور ہوں میری مدد کرو اور اس مصیبت سے مجھے بچا لو۔ پھر جیسا کہ عورت کی فطرت ہے وہ اس پہ مہربان ہونے کے علاوہ اس سے محبت بھی کرنے لگتی ہے۔ اور مناسب مرہم پٹی کے بعد اس محبت کا اظہار بھی کرتی ہے۔ بجو جب محسوس کرتا ہے کہ یہ باتیں اس کے آدرش میں رکاوٹ کا باعث ہو سکتی ہیں تو وہ وہاں سے بھاگ نکلتا ہے۔ راستے میں اس کی ملاقات مشر (نکری) سے ہو جاتی ہے۔ جو اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ شام کو جب وہ بجو کو ٹھاکر دیوی سنگھ کی دعوت پر لے کر جاتا ہے۔ وہاں کم کم کو ناچتے دیکھ کر اس کے دل کی عجیب حالت ہوتی ہے۔ ٹھاکر دیوی سنگھ موقعہ کا فائدہ اٹھا کر بجو کو قتل کروا دینا چاہتا ہے۔ مگر [illegible]

گلشنی امرتسر

ہمدرد دواخانہ کی ادویات

مشورہ اور لٹریچر مفت

زندگی کی پُرپیچ اور ناہموار راہوں سے گذرتے ہوئے —
کبھی نہ کبھی ان ادویات کی ضرورت محسوس ہو ہی جاتی ہے

نونہال
ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا ان کا پسندیدہ ٹانک

صافی
خون کی صفائی اور صحت کی حفاظت کیلئے لازوال دوا

معجون شباب
مردانہ طاقت کو بڑھانے اور قائم رکھنے کیلئے بہترین شے

ماءاللحم
بڑھاپے کو دور رکھنے کے لیے ایک نادر تحفہ

علاوہ ازیں ہر قسم کی آیورویدک اور یونانی ادویات خریدنے کیلئے ہمارے ہاں تشریف لاویں

جی ایس میڈیسن کمپنی کٹڑہ سفید امرتسر

پیشکش

شوری فلمز کا نیا شاہکار

ایک داستان جس میں زندہ رہنے کی آرزو بھی اور کسی پہ مر مٹنے کی معصوم تمنا بھی

زندگی کی ایسی تصویر جس میں درد بھی ہے اور مٹھاس بھی —!

ہدایات :- روپ کے شوری

گانے :- عزیز کاشمیری

موسیقی :- ونود

مینا - کرن دیوان - مجنوں - ششی

ار دسمبر سے جالندھر - امرتسر - لدھیانہ - انبالہ پٹیالہ میں ریلیز ہو رہا ہے۔

پنجاب کے لیے تقسیم کار :- نیشنل فلمز ریلوے روڈ جالندھر شہر

cember, 1953. Pagdandi Amritsar Regd. No. E.P. 68

Price Rs. 3-00

ADBISTAN - I - URDU
Hall Bazar, AMRITSAR.

امید، حرکت اور روشنی کا پیامبر

ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر

جون ۱۹۶۰ء

مدیر
امریک آنند

جلد ۸ شمارہ ۶
قیمت آٹھ آنے
سالانہ چھ روپے

صدر دفتر
ہال بازار - امرتسر

ٹیلیفون
دفتر ۲۲۲۴
رہائش ۴۷۹۳

ادارۂ ادبستان اردو۔ ہال بازار امرتسر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :-
مکتبۂ افکار، رابسن روڈ کراچی

اداریہ

جانِ سخن

دلّی ریڈیو اسٹیشن کے اردو پروگرام

آج کی ترقی یافتہ دنیا میں کسی حکومت کے لیے ریڈیو سے زیادہ اہم، دوسرا کوئی ادارہ ایسا نہیں جو عوام سے اتنا ہمہ گیر رابطہ قائم رکھ سکے۔ آج دنیا کے تمام ممالک ریڈیو کو اپنے مفاد و مقاصد کے لیے طرح طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ خالص سیاسی مضامین اور تقریروں سے لے کر ادب، موسیقیت، ڈراما اور فیچر تک ہر چیز کی تہ میں ریڈیو کا ایک مقصد پوشیدہ ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ عوام کے ذہنوں پر اثر کرتا رہتا ہے۔ چونکہ ریڈیو حکومت اور عوام کے درمیان حرفِ ربط کا کام دیتا ہے اس لیے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اگر ایک طرف حکومت اُسے اپنے مقاصد اور مفاد کے مطابق بنائے اور استعمال کرے تو دوسری طرف مساوی طور پر یہ بھی پوری طرح نظر میں رکھے کہ عوام کیا چاہتے ہیں؟ سننے والوں کی تعداد بڑھانے میں اسی سے کامیابی ہو سکتی ہے۔

اگلے برس، ہندستان میں ریڈیو کے قیام کو ۲۵ برس پورے ہو جائیں گے۔ یہ ۱۹۳۶ء میں قائم ہوا تھا اور ۱۹۴۷ء تک دس برس کے اندر صرف چار اسٹیشن کام کر رہے تھے۔ آزادی کے بعد ہماری حکومت نے اس پر بہت توجہ کی اور کروڑوں روپیہ صرف کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اسٹیشنوں کی تعداد ۲۸ تک پہنچ چکی ہے یعنی ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں چھ گنی سے بھی زیادہ! تقریباً تمام صوبوں کے بڑے بڑے شہروں میں مقامی نشریے کا انتظام ہے۔ دہلی میں ریڈیو اسٹیشن کا قیام اور اس کی تمام پلاننگ بڑے ماہروں نے کی تھی جن میں ایک احمد شاہ بخاری پطرس بھی تھے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے بانی ڈائرکٹر جنرل تھے۔ انھوں نے اس کے پروگرام کو دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ ہم دوسرے موضوعات اور شعبوں سے تو سردست بحث نہیں کرتے لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے اس کے پروگرام انتہائی دلچسپ، جاں دار، تفریحی اور معلومات افزا ہوتے تھے۔ اس پر لکھنے والوں میں بھی اردو کے بہترین مشاق اور ذہین ادیب جمع ہو گئے تھے مثلاً رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، چودھری سلطان، خواجہ محمد شفیع۔ آزاد، مجاز، بیدی، کرشن چندر، منٹو اور نہ جانے کتنے ہی نئے اور پرانے لکھنے والوں کے نام آپ کو مل جائیں گے جن کا یا تو مستقل ریڈیو سے تعلق تھا یا انھیں بار بار دعوت دی جاتی تھی۔ خود پطرس نے بھی اپنے بعض بہترین مضامین (جو اب اُن کے مجموعہ "مضامین پطرس" میں شامل ہیں) اصلاً ریڈیو ہی کے لیے لکھے تھے۔ اسی سے اُن کے شغف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ ریڈیو کی کم اور اردو کی بدنصیبی زیادہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ایک ایک کر کے ان تمام حضرات کا تعلق کسی نہ کسی سبب سے منقطع ہوتا گیا۔ اب اس دور کی یادگار ایک آدھ آدمی رہ گئے ہیں۔ اُن کا بھی دلی اسٹیشن سے تعلق نہیں ممالک غیر کے لیے ہونے والے نشریات سے متعلق ہیں۔

اردو کے پروگرام آج بھی کم نہیں ہوتے۔ حیدرآباد، لکھنؤ، جالندھر، پٹنہ، بمبئی وغیرہ کے اسٹیشنوں کو چھوڑ دیجیے تو صرف

تا ہے؟ کوئی ڈراما ہو، مباحثہ ہو، تنقیدی پروگرام ہو، کتابوں پر تبصرے ہوں، ساہتیہ سماروہ کی نمائندگی ہو، نتیجہ ہمیشہ ڈاکٹر محمد حسن
کیوں ترجیح دی جاتی ہے۔ کیا اس لیے کہ آج سوائے ڈاکٹر محمد حسن کے اور کوئی نقاد ساغر نظامی کی شاعری کا معترف و مداح نہیں ہے؟
اکٹر محمد حسن رومانوی تحریک سے ہے کہ جدید شاعری کے ہر دور کی تاریخ میں ساغر نظامی کی شاعری کو فٹ کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ کیا ریڈیو کے ارباب اختیار و اقتدار ہمیں بتا سکتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، قاضی عبد الودود، مولانا
باز علی عرشی، نجیب اشرف ندوی، خلیق احمد نظامی، سعید احمد اکبر آبادی، سید حسن عسکری، ڈاکٹر [illegible] انور، ڈاکٹر گیان چند جین
ار الدین آرزو، نور الحسن ہاشمی، تلوک چند محروم، حیرت شملوی، شاد عارفی، بسمل سعیدی وغیرہ حضرات میں ایسی کون سی خامی ہے جو یہ
براڈکاسٹنگ کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ کیا اردو میں صرف وہی لوگ ریڈیو کے لیے لکھنے کے اہل ہیں جنہیں ساغر نظامی صاحب
ند فرمائیں؟ اور کیا شاعروں میں سلیم کلکتوی، جمیل تاباں، عزیز وارثی، کامل نظامی، واقف مراد آبادی، کرشن موہن، گوپال متل
ثر میں وقار رضوی، ریوتی سرن شرما، فکر تونسوی وغیرہ ایسے حضرات ہیں کہ انھیں پہلے گنائے ہوئے ناموں پر بالمرجح ترجیح دی
سکے؟ ہمارے ایک دوست کو جو اردو کے ایک ذہین نوجوان شاعر اور ادیب ہیں دہلی ریڈیو سے ایک سال میں ایک پروگرام بھی
شکل ملتا تھا مگر اب جنوری ۱۹۶۰ء سے مئی ۱۹۶۰ء تک انھیں جو پروگرام دیے گئے ان کی تعداد پانچ ہے گویا ہر ماہ ایک پروگرام
گیا ہے۔ ہمیں اس پر اعتراض نہیں بلکہ خوشی ہے کہ ہمارے عزیز نوجوان دوست کی قدر افزائی ریڈیو نے کی ہے لیکن ہم یہ معلوم کرنا چاہتے
یں کہ اوپر جن بزرگ اساتذہ اور ادیبوں کے نام ہم نے گنوائے ہیں کیا انھیں پانچ سال میں بھی ریڈیو میں اتنا قابل اعتنا اور درخور اعتنا
سمجھا گیا ہے؟

ہماری انتہائی خواہش یہ تھی کہ کسی کا نام قلم سے نہ نکلے اور صرف اصولی باتیں لکھ کر ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکیں لیکن
فسوس کہ یہ مسئلہ اتنا نازک اور ذمہ داری اتنی اہم ہے کہ ہم یہ التزام نہیں کر سکتے۔

دہلی ریڈیو پر اردو کے اتنے گنے پروگرام ہیں ان میں بھی بعض سیریز (سلسلہ تقاریر) چلائی جاتی ہیں۔ اگر یہ سیریز زیادہ سے
زیادہ چار یا پانچ پروگراموں تک ہوں تو یقیناً مفید اور اہم ہے لیکن اردو کا باوا آدم ہی سب سے نرالا ہے۔ "فراموش اصناف"
کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس میں مثنوی کے عنوان سے دو سال تک سلسلہ جاری رہا اس میں چھوٹی بڑی، اچھی اور بری تمام مثنویوں
پر روکھی پھیکی تقریروں کا ایک انبار لگ گیا ایسے لوگ جو فی الواقع ادب یا تنقید سے لگاؤ نہیں رکھتے ریڈیو میں دو چیزوں کی
لالچ سے آتے ہیں۔ ایک تو شہرت اور ناموری۔ دوسرے معاوضہ۔ انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ تقریر کیسے لکھی جائے،
کتنا پڑھا جائے، زبان کیسی ہو، انداز بیان کیا ہو۔ ریڈیو کے لیے انشا پردازی اور لفاظی کی ضرورت نہیں یہ تو کارگہ شیشہ گراں
ہے جہاں سانس بھی آہستہ لیا جاتا ہے اور ہر لفظ کے ساتھ وقت بھی گزرتا جاتا ہے اس لیے غور و فکر کے ساتھ مختصر ترین لفظوں
میں واضح اور جامع بات لکھنا مقرر کا کمال ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ذاتی تجربے سے جانتے ہیں کہ بیشتر حضرات ریڈیو کے معمولی آداب
کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ایک صاحب میر انیس کے اسپیشلسٹ سمجھ کر کہیں باہر سے بلائے گئے تھے وہ تقریر کے دوران میں اتنی
زور سے کھانستے کھنکارتے تھے کہ طبیعت سخت منغض ہوتی تھی۔ اکثر حضرات غلط تلفظ سے پڑھتے ہیں۔ ایک بزرگوار نے مستغنی
کو بروزن مستثنیٰ پڑھا تھا۔ ایک بڑے سیاسی "علامہ" رجحان کو رُجحان بروزن بُہتان پڑھ گئے تھے۔ غرض ان باتوں کو کہاں تک
نوٹ کیا جائے۔ گوپال متل کو ریڈیو سے نظم و نثر دونوں قسم کے پروگرام ملتے ہیں۔ پہلے وہ خود پڑھا کرتے تھے لیکن شاید بعض لوگوں نے
یہ اعتراض کیا کہ ان کی آواز اور لب و لہجہ مائک کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اب ان کا لکھا ہوا مسودہ یا تو ساغر صاحب خود پڑھ دیتے
ہیں یا کسی اور سے پڑھوایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ یہ معاملہ کیوں نہیں ہے۔ وہ اپنی آواز کی مجبوری کے باعث
پروگرام قبول کرنے سے احتراز کرتے ہیں تو ریڈیو کا فرض ہے کہ ان سے لکھوا کر کسی اور سے پڑھوائے۔

اب ایک سلسلہ بڑے آدمیوں سے انٹرویو کا شروع ہوا ہے۔ اس میں بہتر یہ تھا کہ پہلے بزرگوں سے ابتدا کی جاتی۔ حضرت آرزو لکھنوی، محوی صدیقی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، امتیاز علی عرشی، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، جگر بریلوی اور کتنے ہی بزرگ اساتذہ، عالم اور ناقد ہیں جن کی زندگی اور کارنامے ہمارے نوجوان ذہنوں کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی فرق مراتب اٹھا دیا گیا ہے۔ اکثر انٹرویو خود ساغر صاحب صدا بند کرتے ہیں اور بے سروپا باتوں میں سارا وقت گزر جاتا ہے۔ ہم ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ ابھی پچھلے ماہ ظ۔ انصاری کا سے انٹرویو لیا گیا۔ نا شاعر نہیں، نقاد نہیں، عالم یا محقق نہیں، محض اور صرف ایک صحافی ہیں وہ بھی ترقی پسند تحریک کے ساختہ پرداختہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے آدمی ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت ہرگز نہیں کہ ریڈیو سے ان کا انٹرویو اتنے بزرگوں سے پہلے نشر کیا جاتے۔ اس میں یہ مصلحت ہو سکتی ہے کہ وہ ماسکو میں بدیشی زبانوں کے اشاعت گھر سے متعلق ہیں جہاں زیادہ تر کمیونسٹ ادیبوں کی بدترین تخلیقات کے روسی ترجمے بہترین ادب کا لیبل لگا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ خیر اگر انٹرویو کیا بھی گیا تھا تو سوال جواب ہی ڈھنگ کے ہوتے۔ ذرا مکالمے کا ایک جملہ نمونے کے طور پر ملاحظہ فرمایئے:۔

ساغر: کیوں ظ صاحب موجودہ دور میں غزل کی مقبولیت نظم پر حاوی رہی ہے۔ کیا یہ غزل کی فتح نہیں ہے۔

ظ: ساغر صاحب اگر اس پارلیمنٹ اسٹریٹ پر جو بس آ رہی ہے اس کے سامنے ایک بھینس آ جائے تو کیا آپ اسے بھینس کی فتح سمجھیں گے؟

سبحان اللہ: غالب کے دور تک تو مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے استعاروں میں ہو جاتی تھی اب دور جدید میں غزل اور نظم کے موازنے بھینس اور بس سے کیے جا رہے ہیں اور یہ بھی غور فرمایئے کہ انٹرویو کون لے رہا ہے کون دے رہا ہے اور کہاں سے سنایا جا رہا ہے!

دہلی ریڈیو کے اردو پروگراموں میں احساس تناسب کا بھی فقدان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروگرام مرتب کرنے والے حضرات کے دماغ کی ترازو میں پاسنگ آ گیا ہے۔ ایک سلسلہ مباحثہ کا ہوتا تھا (اور اب یہ بہت دنوں سے بند کر دیا گیا ہے کیونکہ اس میں کبھی کبھی کوئی اچھی بات بھی ہو جاتی تھی!) اس میں اکثر یہ دیکھا گیا کہ دو نام تو بہت ہی اعلیٰ مرتبے کے ہیں مثلاً پروفیسر محمد مجیب ڈاکٹر تارا چند یا مرزا محمود بیگ، تیسرا ایک مبتدی بیٹھا ہوا ہے اور چوتھے تو ہمیشہ ساغر نظامی ہوا ہی کرتے ہیں ______

ریڈیو پر اگر کسی شخص کو پہلی بار پروگرام دیا جائے تو ہونا یہ چاہیئے کہ اس سے ذرا ما لکھوائیں یا کہانی یا مضمون۔ اس کی صلاحیت کا امتحان کرنے کے بعد اسے کسی اہم موضوع پر بولنے کا موقع دیں لیکن ریڈیو پر اس کے برعکس ہوتا ہے اور ایسے حضرات کے ساتھ مبتدیوں کو شریک کر دیا جاتا ہے جن کے سامنے وہ بولے تو گھبراہٹ میں منہ سے غلط نکلے ورنہ خاموش بیٹھا رہے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک نوجوان وقار احمد رضوی کو مباحثے میں شریک کیا گیا تھا انھوں نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ "علم عروض، معانی سے بحث کرتا ہے" یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ترازو میں تولنے سے چیز کی اچھائی یا برائی معلوم ہوتی ہے!

ہمیں اپنی درازنفسی کا دہ رہ کر خیال آ رہا ہے کہ سلسلۂ کلام بہت طویل ہو گیا اور موضوع کہہ رہا ہے کہ:

ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است

لیکن چاہتے ہیں کہ ریڈیو کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے وہ ذرا وضاحت سے کہہ دیں خواہ اسے عوام کی دوسری شکایتوں کی طرح DISGRANTED ELEMENT کے ریمارک کے ساتھ فائلوں کے قید خانے میں محبوس ہی ہو جانا پڑے۔

ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ ساغر نظامی ادب کے راستے سے نہیں بلکہ سیاست کے دروازے سے، اور وزرا و حکام کے اشارہ چشم و ابرو سے ریڈیو میں باریاب ہوئے ہیں اور حکومت کو اس سے ریڈیو کی فلاح و بہبود یا اردو پروگراموں کی ترقی و مقبولیت اتنی مدنظر نہیں جتنی ایک سیاسی شاعر کی پرورش منظور ہے۔ اس لیے جب کبھی پریس سے یا عوام سے کوئی آواز دہلی ریڈیو کے

ـکے پروگراموں کے بارے میں اٹھائی گئی ہے اُسے یہ کہہ کر دبا دیا گیا ہے کہ یہ ذاتی مخاصمت پر مبنی ہے، یا فلاں شخص نے اسے اپنے خلاف
ہے کہ خود اسے ریڈیو کے پروگرام نہیں دیے جاتے۔ پھر یہ کہ فرمائش کر کے فرضی ناموں سے تعریفی خطوط کا سلسلہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔
ان شکایتوں کو بیلنس میں رکھیں ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی فرد یا ادارہ طے کر لے (اور خصوصاً سرکاری ادارہ) کہ کسی شکایت پر کان دھرنا
نہیں ہے تو ہماری نالہ و زاری کا وہی حشر ہوتا ہے جو مومن نے کہا ہے:

کہتے ہیں تجھ کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

آخر میں ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ تجاویز پیش کریں جن سے ریڈیو کے ان پروگراموں کو بہتر بنایا جا سکے۔ ہمارا خیال یہ
ہے کہ اردو کے پروگرام چار قسم کے ہونے چاہئیں۔

(۱) معلومات افزا۔ جن سے تاریخ، تہذیب و تمدن، اخلاقیات، ادب، فنون لطیفہ اور دوسرے گوشوں کا تعارف عوام سے ہو۔
اس ضمن میں وہ مضامین ہوں جن سے سننے والوں کو یہ محسوس ہو کہ انھیں عقل کی خوراک ملی ہے۔ ان کے ذہن کے جالے صاف ہوں اور
دل و دماغ کی کھڑکیوں سے کچھ تازہ ہوا بھی گزرے۔ ہر وقت ماضی کو روتے رہنا اور اس کی قصیدہ خوانی کرنا زیادہ خوش آیند بات
نہیں ہے۔ کچھ مستقبل کا شعور بھی پیدا ہونا چاہیے۔

(۲) تفریحی۔ اس ذیل میں ہلکے پھلکے انشائیے جن میں طرز ادا کا لطف، لب و لہجے کا رس اور خیال کی شگفتگی ہو۔ ضلع جگت،
اور طنز و مزاح کے نمونے، لطیف استعارے اور کنائے ہوں۔ اسٹائل کا بانکپن ہو۔ مثلاً جو خوبی پطرس، کنہیا لال کپور، اور
رشید احمد صدیقی کے مضامین میں پائی جاتی ہے (اب تو ریڈیو کے لیے صرف ایک مزاح نگار فکر تونسوی رہ گئے ہیں جو آٹھ برس
سے پیاز کے چھلکے" اتار رہے ہیں)

(۳) فکر انگیز۔ تناسب کے لحاظ سے ایک حصہ ایسے مضامین کا رکھا جائے جو فکر انگیز ہوں۔ فلسفہ، تاریخ، فلسفہ زندگی، اخلاقیات
نفسیات، ادب، سماجی مسائل اور دوسرے موضوعات پر ہلکے پھلکے انداز میں ایسے مضامین لکھوائے جائیں جو ذہنوں کو جھنجھوڑ دیں
اور سننے والوں میں یہ احساس پیدا کریں کہ غور و تامل کا ملکہ بھی ہر انسان کو قدرت نے ودیعت کیا ہے۔ ایسے مضامین کے فائدے
بڑے دور رس اور دیرپا ہوں گے۔ فکر انگیز مضامین لکھنے والے اردو میں بہت کم حضرات ہیں۔ کیوں کہ اس زبان کو تقلید کی قید سے
ہی آزادی نہیں ملی۔ تخلیقی فکر کا بے حد فقدان ہے پھر بھی کوشش کرنے سے سب کچھ آسان ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی
ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب وغیرہ سے ایسے مضامین کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(۴) جدید ادب۔ ریڈیو نے اب تک کلاسکی ادب کے سوا کسی چیز کو چھیڑا ہی نہیں۔ یا تو اساتذہ کا کلام تال سر کے ساتھ
گایا جاتا ہے یا اُن پر تنقید کر دی جاتی ہے۔ ہر پھر کر چھ سات برس سے بات وہیں ہے جہاں تھی۔ جدید ادب کو (یعنی ۱۹۴۷ء کے
بعد سے اب تک جو کچھ تخلیقی کام ہوا ہے) بہت کم طرح دی گئی ہے۔ رفتار ادب کا صرف ایک پروگرام مہینوں میں ہوتا ہے
اس میں بھی ہر مقرر یہ کوشش کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے دوستوں اور واقفوں کی تعریف کے لیے وقف کر سکے۔ اگر
ایسا نہیں تو پھر اپنے نظریات اور اپنے مدرسۂ فکر کے مطابق بات کرتا ہے۔ عمومی جائزے کی بات نہیں ہونے پاتی۔
جدید ادب کے بہت سے موضوعات ایسے ہیں جن پر ہلکی پھلکی اور معلومات افزا تقریریں ہو سکتی ہیں اور ان کے نمونے بھی
پیش کیے جا سکتے ہیں۔ "ہلکی پھلکی" پر ہم اس لیے زور دیتے ہیں کہ ریڈیو کا مقصد علم کو وسیع کرنا اور روشن دماغوں کی تعداد میں
اضافہ کرنا ہے نہ یہ کہ اوسط درجے کے اذہان سے تقریر کرا کے لقمان کو حکمت سکھائی جائے۔
اس سلسلے میں ہمارے دو نہایت مخلصانہ مشورے اور بھی ہیں جنھیں بہت اہمیت حاصل ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ پطرس کے

اب ایک سلسلہ بڑے ادیبوں سے انٹرویو کا شروع ہوا ہے۔ اس میں بہتر تھا کہ پہلے بزرگوں سے ابتدا کی جاتی۔ حضرت اثر لکھنوی، محوی صدیقی، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، امتیاز علی عرشی، ملوک چند محروم، جوش ملسیانی، جگر بریلوی اور کتنے ہی بزرگ اساتذہ، عالم اور ناقد ہیں جن کی زندگی اور کارنامے ہمارے نوجوان ذہنوں کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی فرق مراتب اٹھا دیا گیا ہے۔ اکثر انٹرویو خود ساغر صاحب صدا بند کرتے ہیں اور بے سروپا باتوں میں سارا وقت گزر جاتا ہے۔ ہم ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ ابھی پچھلے ماہ ظ۔ انصاری سے انٹرویو لیا گیا۔ ظ شاعر نہیں، نقاد نہیں، عالم یا محقق نہیں، محض اور صرف ایک صحافی ہیں وہ بھی ترقی پسند تحریک کے ساختہ پرداختہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے آدمی ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت ہرگز نہیں کہ ریڈیو سے ان کا انٹرویو اتنے بزرگوں سے پہلے نشر کیا جاتے۔ اس میں یہ مصلحت ہو سکتی ہے کہ وہ ماسکو میں بدیشی زبانوں کے اشاعت گھر سے متعلق ہیں جہاں زیادہ تر کمیونسٹ ادیبوں کی بدترین تخلیقات کے روسی ترجمے بہترین ادب کا لیبل لگا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ خیر اگر انٹرویو کیا بھی گیا تھا تو سوال جواب ہی ڈھنگ سے ہوتے۔ ذرا مکالمے کا ایک جملہ نمونے کے طور پر ملاحظہ فرمائیے:-

ساغر: کیوں ظ صاحب موجودہ دور میں غزل کی مقبولیت نظم پر حاوی رہی ہے۔ کیا یہ غزل کی فتح نہیں ہے۔

ظ: ساغر صاحب اگر اس پارلیمنٹ اسٹریٹ پر جو بس آ رہی ہے اس کے سامنے ایک بھینس آ جائے تو کیا آپ اسے بھینس کی فتح سمجھیں گے؟

سبحان اللہ! غالب کے دور تک تو مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے استعاروں میں ہو جاتی تھی اب دور جدید میں غزل اور نظم کے موازنے بھینس اور بس سے کیے جا رہے ہیں اور یہ بھی غور فرمائیے کہ انٹرویو کون لے رہا ہے کون دے رہا ہے اور کہاں سے سنایا جا رہا ہے!

دہلی ریڈیو کے اردو پروگراموں میں احساس تناسب کا بھی فقدان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروگرام مرتب کرنے والے حضرات کے دماغ کی ترازو میں پاسنگ آ گیا ہے۔ ایک سلسلہ مباحثہ کا ہوتا تھا اور اب یہ بہت دنوں سے بند کر دیا گیا ہے کیونکہ اس میں بھی کبھی کوئی اچھی بات بھی ہو جاتی تھی!) اس میں اکثر یہ دیکھا گیا کہ دو نام تو بہت ہی اعلیٰ مرتبے کے ہیں مثلاً پروفیسر محمد مجیب لفٹر تارا چند یا مرزا محمود بیگ، تیسرا ایک مبتدی بیٹھا ہوا ہے اور چوتھے تو ہمیشہ ساغر نظامی ہوا ہی کرتے ہیں

ریڈیو پر اگر کسی شخص کو پہلی بار پروگرام دیا جائے تو ہونا یہ چاہیئے کہ اس سے ڈراما لکھوائیں یا کہانی یا مضمون۔ اس کی صلاحیت کا امتحان کرنے کے بعد اسے کسی اہم موضوع پر بولنے کا موقع دیں لیکن ریڈیو پر اس کے برعکس ہوتا ہے اور ایسے حضرات کے ساتھ مبتدیوں کو شریک کر دیا جاتا ہے جن کے سامنے وہ بولے تو گھبراہٹ میں منہ سے غلط نکلے ورنہ خاموش بیٹھا رہے۔ ہمیں یاد ہے ایک نوجوان وقار احمد رضوی کو مباحثے میں شریک کیا گیا تھا انھوں نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ "علم عروض معانی سے بحث کرتا ہے" یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ترازو میں تولنے سے چیز کی اچھائی یا برائی معلوم ہوتی ہے!

ہمیں اپنی درازنفسی کا دہ رہ کر خیال آ رہا ہے کہ سلسلۂ کلام بہت طویل ہو گیا اور موضوع کہہ رہا ہے کہ:

ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است

ہم چاہتے ہیں کہ ریڈیو کے بارے میں جو کچھ کہنا ہے وہ ذرا وضاحت سے کہہ دیں خواہ اسے عوام کی دوسری شکایتوں کی طرح DISGRANTED ELEME[NTS] کے ریمارک کے ساتھ فائلوں کے قید خانے میں محبوس ہی ہو جانا پڑے۔

ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ ساغر نظامی ادب کے راستے سے نہیں بلکہ سیاست کے دروازے سے اور وزرا و حکام کے اشارہ سے ریڈیو میں بار یاب ہوئے ہیں اور حکومت کو اس سے ریڈیو کی فلاح و بہبود یا اردو پروگراموں کی ترقی و مقبولیت مد نظر نہیں جتنی ایک سیاسی شاعر کی پرورش منظور ہے۔ اس لیے جب کبھی پریس سے یا عوام سے کوئی آواز دہلی ریڈیو کے

اُردو کے پروگراموں کے بارے میں اٹھائی گئی ہے اُسے یہ کہہ کر دبا دیا گیا ہے کہ یہ ذاتی مخاصمت پر مبنی ہے، یا فلاں شخص نے اس لیے خلاف لکھا ہے کہ خود اسے ریڈیو کے پروگرام نہیں دیے جاتے۔ پھر یہ کہ فرمائش کرکے فرضی ناموں سے تعریفی خطوط کا سلسلہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ شکایتوں کو بیلنس میں رکھیں ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی فرد یا ادارہ طے کرلے (اور خصوصاً سرکاری ادارہ) کہ کسی شکایت پر کان دھرنا ہی نہیں ہے تو ہماری نالہ زنی کا وہی حشر ہوتا ہے جو مومن نے کہا ہے:

کہتے ہیں تجھ کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

آخر میں ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ تجاویز پیش کریں جن سے ریڈیو کے ان پروگراموں کو بہتر بنایا جاسکے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اُردو کے پروگرام چار قسم کے ہونے چاہئیں۔

(۱) معلومات افزا۔ جن سے تاریخ، تہذیب و تمدن، اخلاقیات، ادب، فنونِ لطیفہ اور دوسرے گوشوں کا تعارف عوام سے ہو۔ اس ضمن میں وہ مضامین ہوں جن سے سننے والوں کو یہ محسوس ہو کہ انھیں عقل کی خوراک ملی ہے۔ ان کے ذہن کے جالے صاف ہوں اور دل و دماغ کی کھڑکیوں سے کچھ تازہ ہوا بھی گزرے۔ ہر وقت ماضی کو روتے رہنا اور اس کی قصیدہ خوانی کرنا زیادہ خوش آیند بات نہیں ہے۔ کچھ مستقبل کا شعور بھی پیدا ہونا چاہیئے۔

(۲) تفریحی۔ اس ذیل میں ہلکے پھلکے انشائیے جن میں طرزِ ادا کا لطف، لب و لہجے کا رس اور خیال کی شگفتگی ہو۔ ضلع جگت، اور طنز و مزاح کے نمونے، لطیف استعارے اور کنائے ہوں۔ اسٹائل کا بانکپن ہو۔ مثلاً جو خوبی پطرس، کنہیا لال کپور، اور رشید احمد صدیقی کے مضامین میں پائی جاتی ہے (اب تو ریڈیو کے لیے صرف ایک مزاح نگار فکر تونسوی رہ گئے ہیں جو آٹھ برس سے پیاز کے چھلکے "اتار رہے ہیں)

(۳) فکر انگیز۔ تناسب کے لحاظ سے ایک حصہ ایسے مضامین کا رکھا جائے جو فکر انگیز ہوں۔ فلسفہ تاریخ، فلسفہ زندگی، اخلاقیات نفسیات، ادب، سماجی مسائل اور دوسرے موضوعات پر ہلکے پھلکے انداز میں ایسے مضامین لکھوائے جائیں جو ذہنوں کو جھنجھوڑ دیں اور سننے والوں میں یہ احساس پیدا کریں کہ غور و تامل کا ملکہ بھی ہر انسان کو قدرت نے ودیعت کیا ہے۔ ایسے مضامین کے فائدے بڑے دور رس اور دیرپا ہوں گے۔ فکر انگیز مضامین لکھنے والے اُردو میں بہت کم حضرات ہیں۔ کیوں کہ اس زبان کو تقلید کی قید سے ہی آزادی نہیں ملی۔ تخلیقی فکر کا بے حد فقدان ہے پھر بھی کوشش کرنے سے سب کچھ آسان ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب وغیرہ سے ایسے مضامین کی توقع کی جاسکتی ہے۔

(۴) جدید ادب۔ ریڈیو نے اب تک کلاسکی ادب کے سوا کسی چیز کو چھیڑا ہی نہیں۔ یا تو اساتذہ کا کلام تال سر کے ساتھ گایا جاتا ہے یا اُن پر تنقید کر دی جاتی ہے۔ ہر پھر کر حد سات بر س سے بات وہیں ہے جہاں تھی۔ جدید ادب کو (یعنی ۱۹۳۶ء کے بعد سے اب تک جو کچھ تخلیقی کام ہوا ہے) بہت کم طرح دی گئی ہے۔ رفتار ادب کا صرف ایک پروگرام مہینوں میں ہوتا ہے اس میں بھی ہر مقرر یہ کوشش کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے دوستوں اور واقفوں کی تعریف کے لیے وقف کر سکے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر اپنے نظریات اور اپنے مدرسۂ فکر کے مطابق بات کرتا ہے۔ عمومی جائزے کی بات نہیں ہونے پاتی۔

جدید ادب کے بہت سے موضوعات ایسے ہیں جن پر ہلکی پھلکی اور معلومات افزا تقریریں ہوسکتی ہیں اور ان کے نمونے بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ "ہلکی پھلکی" پر ہم اس لیے زور دیتے ہیں کہ ریڈیو کا مقصد علم کو وسیع کرنا اور روشن دماغوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے نہ یہ کہ اوسط درجے کے ادیب سے تقریر کرا کر لقمان کو حکمت سکھائی جائے۔

اسی سلسلے میں ہمارے دو نہایت مخلصانہ مشورے اور بھی ہیں جنھیں بہت اہمیت حاصل ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ پطرس مرحوم

کے زمانہ میں اور آزادی کے بعد بھی جب تک کرتار سنگھ دگل وغیرہ شعبہ اردو کے انچارج تھے، ریڈیو میں لکھنے والوں کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ریڈیو کی موٹر اس کے گھر پہنچ گئی۔ مقرر آیا تو تمام اسٹاف نے نہایت احترام و اکرام اور مہمان نوازی و خوش اخلاقی کا ثبوت دیا، تقریر کے بعد اسے موٹر کے ذریعے واپس کر دیا گیا۔ اب موٹر بھیجنے کا سلسلہ تو ریڈیو نے کسی مصلحت یا مجبوری کے باعث بند کر دیا ہے (ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں) لیکن ہم یہ [illegible] کہ [illegible] اردو کے ادیبوں کے ساتھ) نہایت اہانت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ ریڈیو میں ان کی اوقات چند پیسے کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس شخص نے ریڈیو کا پروگرام قبول کر کے کرم کیا ہے۔ اب نظریہ ہی بدل گیا ہے۔ ریڈیو [illegible] روپے کا ایک پروگرام دے کر ادیب کے حال پر عنایت کی جاتی ہے۔ اس کی پراگندہ معاشی، افلاس اور کس مپرسی کا پورا پورا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اردو سیکشن کا عملہ خود سقراط، بقراط اور افلاطون قسم کے "فلسفی ادیبوں" اور "محب وطن شاعروں" پر مبنی ہے اور اسے یہ غرہ ہے کہ اس سے زیادہ اردو ادب و شعر کو کسی نے مالا مال نہیں کیا، پھر یہ کہ سیاسی حلقوں میں اس کی رسائی ہے اور برسر اقتدار لوگوں کا ہاتھ اس کے سر پر ہے، چند "بے تہ" نقاد اور ایک دو اخبار اس کی جیب میں ہیں۔ لہٰذا اب کسی ادیب کے اعزاز و اکرام کی ضرورت بھی کیا ہے! اس رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر سنجیدہ ادیب اور عالم ریڈیو اسٹیشن پر جانا اور درباری آداب و القاب کی تکمیل کے مرحلوں سے گزر کر تقریر کرنا اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں۔ ایسے بڑے عالموں اور ادیبوں کی شہرت یا مقبولیت ریڈیو کی بادِ ہوائی باتوں سے تو بنی نہیں ہے ان کی زندگی کا ٹھوس کام اور مسلسل لگن کے ساتھ محنت و ریاضت کا سرمایہ ان کے ساتھ ہے اس لیے شہرت کا لالچ تو ایک لمحے کے لیے ان کے دامن دل کو نہیں کھینچ سکتا۔ معاوضے کی لالچ میں وہ اپنی وضع بدل نہیں سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے سنجیدہ اور ذی علم لوگوں کو عزت و تکریم کے ساتھ ریڈیو میں آنے کی دعوت دی جائے اور اس طرح پروگراموں کے معیار کو بلند کیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریڈیو سے جو اردو کے پروگرام ہوتے ہیں ان سے اردو کو بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ نادان دوست پہنچا رہے ہیں۔ ہم دعوا یہ کرتے ہیں کہ اردو ہندستان بھر میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے، اردو کے مخالف کہتے ہیں کہ جس زبان کا نام اردو رکھا گیا ہے وہ مخصوص تمدن کی پیداوار ہے اور سوائے یو۔پی کے چند مسلم گھرانوں کے اسے عام طور سے کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ بات چاہے اصلاً صحیح نہ ہو لیکن ریڈیو کے پروگرام اس کی تصدیق ضرور کرتے ہیں۔ ہندستان میں ۸۰ فی صدی سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی بستی ہے اور صرف ۱۲ فی صدی باشندے پڑھے لکھے ہیں۔ لیکن اردو کے جو پروگرام ہوتے ہیں وہ دیہات کے رہنے والے اور سیدھی سادی زبان بولنے والوں کے تو پلے پڑ نہیں سکتے۔ مخصوص تعلیم یافتہ اور اچھا خاصا ادبی ذوق رکھنے والے ہی ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نقاد، اپنی تنقید میں جیسی مخصوص زبان اور بندھی ٹکی اصطلاحیں، خود ساختہ نظریوں کی روشنی میں تحلیل و تجزیہ اور بے سروپا باتیں کرتے ہیں دیہاتی کو چھوڑ دیجیے کیا شہر کی بھی بڑی آبادی اس میں دلچسپی لے سکتی ہے؟ کنہیا لال کپور کی کوئی تقریر یا ڈراما ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوتا ہے تو اردو سمجھنے والوں میں ۷۵ فی صدی اسے سنتے ہیں اور پسند کرتے ہیں لیکن جب فلاں اور فلاں نقاد "ادب میں روایت اور تجربے" یا "روایتوں میں تجربہ اور ادب" جدید میلانات، سماجی شعور وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں تو کیا اس میں ہر اردو والا دلچسپی لے سکتا ہے! لیکن ہم کہتے [illegible] بار بار یہ سوچتے ہیں کہ ہماری [illegible] کا اثر کیا اور کس پر ہوگا۔ ایک دو سال پہلے مسٹر کرشن [illegible] ہندستان ٹائمز کے کالموں میں ریڈیو پروگراموں پر [illegible] تنقید کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن ہمیں ذاتی طور پر معلوم ہے کہ [illegible] اردو کے پروگرام دیے جاتے تھے لیکن [illegible] نتیجہ وہی ہوا کہ

DISGRANTED

ہمیں دو باتوں کا رنج ہے ایک تو یہ کہ اردو کی حالت ناقص ہے اور بیشتر اداروں میں اس کی صحیح نمائندگی نہیں ہو رہی ہے۔ دوسرا قلق یہ کہ نقصان سب اپنوں ہی کے ہاتھوں سے پہنچ رہا ہے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

ہمیں سب تو ہمارے درون پردہ معلوم ہیں لیکن قانونی مجبوریاں بھی بہت سخت ہوتی ہیں۔ اکثر باتیں ایسی ہیں جو ہمارے علم ویقین کی حد تک بالکل صحیح ہیں لیکن ہم ان کے لیے کوئی مادی ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔ مجبوراً زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں بھی بارہا انھیں کم ظرفوں کا خیال آتا ہے جو اس کی تاویلیں طرح طرح سے کریں گے اور معاملات کے واقعاتی پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بجائے اسے کسی اور بات پر محمول کرنا شروع کر دیں گے۔ یہ بھی سوچتے ہیں کہ بات "ذاتی" سی نہ ہونے پائے صرف اصولی اعتراضات بیان کر دیے جائیں، گفتگو بھی نرم وشیریں رہے اس میں تلخی کا شائبہ آنے نہ پائے اور متانت کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے:

ز شکوہ ہائے جفایت ہزار گوں پر شد لیک
ہنوز رنگ ادب بر رخ سخن باقیست

اتنی ذمہ داریوں کا نباہنا آسان نہیں۔ ممکن ہے ہم ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے ہوں۔ ایسی صورت میں آپ سے معذرت چاہیں گے۔ ہمارے پاس بہت سی باتیں کہنے کے لیے ہیں لیکن اس یادِ جان سخن یوں ہی اچھا خاصا طویل ہو گیا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کی دوسری قسط میں بقیہ سب باتیں بھی آ جائیں۔ آخر میں ہم آپ سے بھی درخواست کریں گے کہ آپ خود دہلی ریڈیو کے اردو پروگراموں کو غور سے سماعت فرمایے اور ان کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہو وہ ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کو لکھ کر بھیجیے تاکہ ارباب اقتدار کو یہ معلوم رہے کہ اردو والے سو نہیں رہے ہیں، بیدار ہیں انھیں اردو پروگراموں کی اہمیت کا احساس ہے اور ان کے معیار کی سطحیت کا افسوس ہے اس سے یقیناً ریڈیو والے اپنی پالیسی اردو کے معاملے میں بدلنے پر مجبور ہوں گے۔ اگر آپ اپنی تجاویز، مشورے، شکایتیں اور حکایتیں ہمیں لکھ کر بھیجیں گے تو ان کی روشنی میں ہم آئندہ پھر اردو پروگراموں پر اظہار رائے کر سکیں گے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا اور امتحان اخلاقی جرأت کا ہے۔ آپ کی ذرا سی مروت سے اردو کا نقصان ہوگا:

گریزد از صفِ ما ہر کہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

مرشد نے کہا: اُن کمینے آدمیوں کے ساتھ! —— اُن کے ساتھ رہ کر بادشاہ کی خدمت کس طرح ممکن ہے! عہدہ ملنے سے پہلے انھیں عہدہ لینے کی فکر ہوتی ہے اور مل جانے کے بعد انھیں فکر ہوتی ہے کہ کہیں ہاتھ سے عہدہ نکل نہ جائے جن لوگوں کو عہدے سے برطرف ہونے کی فکر لگی ہو تو پھر ان کی بد اعمالی کی کوئی حد نہیں ہو سکتی۔

(ملفوظات کونگ فوزی، مترجمہ ظفر حسین خاں)

نثار احمد فاروقی

اردوے معلّٰی: غالب نمبر

(ایک علمی و تحقیقی رسالے کا جائزہ)

اردو کے شاعروں میں مرزا غالب کی شخصیت آج بھی اپنے اندر موہنی رکھتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے اب تک میرزا کی زندگی، شخصیت اور شاعری سے متعلق ایک ہزار سے زیادہ مضامین، مقالے اور تبصرے لکھے گئے ہیں[1] لکھنے والوں نے اُسے ایک عظیم انسان اور "فلسفی" سے لے کر جھوٹا اور مکار تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[2] اور تماشا یہ ہے کہ "غالب کے طرف دار" ہوں یا "غالب شکن" اس کے نام کی برکت سے انھیں شہرت کا کچھ نہ کچھ حصہ مل ہی جاتا ہے۔

ہر سال ماہِ فروری میں، غالب کی یاد منائی جاتی ہے۔ رسالہ آج کل (دہلی) اور ماہِ نو (کراچی) تو بالالتزام کچھ نہ کچھ ہر سال غالب سے متعلق شائع کرتے ہی ہیں، دوسرے رسالے بھی اپنی والی کوشش کر کے، کوئی نہ کوئی پہلو سخن گستری کا نکال ہی لیتے ہیں۔ اس سال دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو نے ایک شش ماہی رسالہ "اردوے معلّٰی" کے نام سے جاری کیا ہے۔ یہ بڑا ہی مبارک اور مستحسن کام ہے۔ دہلی اردو کا مرکز اور ہندستان کی راجدھانی ہے۔ یہاں سے کسی علمی اور ادبی رسالے کا اجرا، ظاہر ہے کس خوشی اور اطمینان کا موجب ہوگا۔ اردوے معلّٰی کا پہلا شمارہ (فروری ۱۹۶۰ء) غالب سے متعلق مضامین و مقالات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک سو سولہ صفحے کی اچھی خاصی کتاب ہے۔ ظاہری حسن دلکش اور نظر فریب ہے۔ رسالے کے ایڈیٹر شعبۂ اردو کے صدر، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ہیں جو "میر تقی میر" لکھ کر اچھی خاصی شہرت کما چکے ہیں۔ پہلے شمارے میں مضامین قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر اشرف، مولانا نیاز فتح پوری، خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے معتبر اور سنجیدہ لکھنے والوں کے شامل ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے غالب کی بعض نئی فارسی تحریریں پہلی بار سامنے آتی ہیں اور غالب شناسوں کے لیے نیا مسالا فراہم کرتی ہیں ہے یوں کہ نوابانِ لوہارو کا کتب خانہ اب رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ کرا دیا گیا ہے۔ اس میں بعض قدیم مطبوعہ کتابیں ایسی بھی آئی ہیں جو میرزا غالب کے مطالعے میں رہ چکی تھیں یعنی لالہ ٹیک چند بہار کا رسالہ "ابطال ضرورت"، خانِ آرزو کا رسالہ "موہبتِ عظمیٰ" اور وارستہ سیالکوٹی کی تالیف "مصطلحات شعرا"۔ دورانِ مطالعہ میں غالب کی رگِ تحقیق پھڑکی ہے تو انھوں نے حواشی میں اپنے قلم سے ... اتی نوٹ بھی لکھ دیے ہیں۔ ان میں بعض بہت دلچسپ ہیں۔ مولانا عرشی نے ان تحریروں کو بڑے سلیقے اور ضبط و نظم کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ غالبیات کے سلسلے میں یقیناً یہ نئی اور اہم دریافت ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے غالب کے کلیاتِ نظم فارسی کے ایک قدیم نسخے کا تعارف کرایا ہے، اور متداول کلیات کے بعض اہم اختلافات کی نشان دہی کی ہے۔ جناب خلیق انجم نے "غالب کی قیام گاہیں" پر لکھا ہے جس میں عہد سے لحد تک کی بہت سی منزلیں آگئی ہیں۔ بعض مکانوں

---

[1] ملاحظہ ہو "غالب نما" مرتبہ نثار احمد فاروقی، رسالہ برہان، فروری، اپریل ۱۹۵۸ء؛ رسالہ تحریک، مارچ ۱۹۶۰ء۔ [مکمل اشاریہ کتابی شکل میں عن قریب شائع ہوگا]

[2] عبدالمالک آروی، غالب کی اخلاقی کمزوریاں، نگار، مارچ ۱۹۴۳ء۔ نیز غالب بحیثیت محقق، مشمولہ نقدِ غالب

کے نوٹ بھی دیے ہیں جن کی وجہ سے مضمون بہت عجیب ہو گیا ہے۔

ایڈیٹر کی طرف سے "شذرات" میں کہا گیا ہے کہ اس ششش ماہی رسالے کا مقصد "تحقیقی اور علمی ضرورتوں" کو پورا کرنا ہے۔ چوں کہ "تحقیقی اور علمی" کاموں کی ذمہ داریاں بہت نازک ہوتی ہیں اس لیے ہمیں یہ توقع تھی کہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی نگرانی میں شائع ہونے والا یہ مجلہ کم از کم معمولی غلطیوں سے تو ضرور پاک ہوگا، لیکن یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ نہ صرف اس میں اِملا و انشا کی غلطیاں ہیں بلکہ "علمی و تحقیقی" اعتبار سے بھی بہت کچھ محتاجِ اصلاح ہے۔ چند ضروری اُمور کی طرف سطورِ ذیل میں توجہ دلائی گئی ہے۔

(۱) "اردوئے معلّٰی" غالب کے مجموعۂ مکاتیب کا نام ہے۔ پھر مولانا حسرت موہانی مرحوم اسی نام کا رسالہ علی گڑھ اور کانپور سے شائع کر چکے ہیں اور رسالوں میں یہ نام گویا اُن کے لیے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ منشی قربان علی بسمل وغیرہ نے اسی نام کا ایک رسالہ دہلی سے جاری کیا تھا[1] جو کتابی سائز پر شائع ہوتا تھا اور بہت دنوں زندہ رہ کر بند ہو گیا۔ شعبۂ اردو کو اب کوئی نیا نام تلاش کرنا تھا تاکہ التباس پیدا نہ ہو۔

(۲) زیرِ نظر شمارے کے سرورق پر جو تصویر دی گئی ہے وہ قطعاً جعلی اور غیر مستند ہے۔ غالب کی اصلی اور معتبر تصاویر دستیاب ہو جاتی ہیں جن میں کچھ موقلم سے بنائی ہوئی ہیں اور ایک تصویر کیمرے کی ہے[2]۔ "اردوئے معلّٰی" میں جو تصویر شامل کی گئی ہے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش سے تھا نعال کے کسی مصور نے تیار کی تھی اور پہلی بار دیوانِ غالب کے جرمنی ایڈیشن میں چھپی تھی۔ مستند تصاویر کی موجودگی میں اسے ترجیح دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔

(۳) ایک رسالہ جو کسی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے "تحقیقی و علمی ضرورتوں" کو پورا کرنے کے لیے نکلے کم از کم صحتِ املا کے لحاظ سے نامعتبر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس معاملے میں "روشِ عام" کی تقلید سند نہیں ہو سکتی۔ راقم الحروف کو یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا کہ ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے اور وہاں ایک عالم کی بڑی شہرت سُنی تو ملاقات کے مشتاق ہو کر اُن سے ملنے کے لیے گئے۔ وہ بزرگوار اس وقت کچھ لکھ رہے تھے اِن کو دیکھ کر کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیا اور کھڑے ہو کر استقبال کیا، ابھی بیٹھ کر بات بھی کرنے نہ پائے تھے کہ یہ ملاقاتی کبیدہ خاطر ہو کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "لاحول ولا قوّة! میں نے تو اس شہر میں آپ کا شہرہ سُنا تھا کہ بڑے عالم و فاضل ہیں، یہاں تو املا بھی صحیح نہیں۔ "لائق" کو "ی" سے (لایق) لکھا جا رہا ہے!" یہ کہہ کر واپس آگئے۔ اُنھوں نے تو ایک لفظ کا غلط املا دیکھ کر اتنے تیور چڑھائے تھے اگر یہ "علمی و تحقیقی" مجلّہ ملاحظہ فرما لیتے تو شاید دنیا ہی سے بیزار ہو جاتے۔ کیوں کہ اس کی پہلی ہی سطر میں "شائع" کو "شایع"، "مبدأ" کو "مبدء" لکھا گیا ہے اور علیٰ ہذا۔

"عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب بالقابہ" (ص ۵) یہاں "ڈاکٹر" لکھنے کے بعد سارے القاب غیر ضروری ہیں۔ علاحدہ، قایم (ص ۵) "وسایل اور ذرایع" (ص ۶) "انشا، اللہ"[3] (ص ۷) "دیئے" (ص ۹) اور ہر جگہ اس طرح لکھا ہے کہ "ی" کے نقطے بھی موجود ہیں اور ہمزہ بھی۔ حالاں کہ ہمزہ زائد ہے۔ ایک جگہ ۱۲۶۸ھ کو مطابق ۱۸۵۱-۵۲ء لکھا ہے (ص ۱۰) اگر ہجری سال صحیح ہے تو ۵۲-۱۸۵۱ ہونا چاہیئے

---

[1] رسالہ اردوئے معلّٰی دہلی ۶-۵/۱ [2] اس کے چند فائل کتب خانۂ نذیریہ دہلی میں محفوظ ہیں اور راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں۔

[2] "دیوانِ غالب نسخۂ عرشی" میں یہ تصویر شامل ہے۔ قلمی تصاویر میں وہ مستند ہے جو کتب خانۂ حبیب گنج میں محفوظ ہے اور ڈاک خانے کے ٹکٹوں پر بھی چھپ چکی ہے۔ حبیب گنج والی تصویر "ذکرِ غالب" مصنفۂ مالک رام میں بھی شامل ہے۔ [نیز دیکھو رسالہ زمانہ کانپور جلد ۶۷ شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۳۶ء) اور "احوالِ غالب" مرتبۂ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو]

جناب غیر بہوروی نے حال ہی میں "مرقعِ غالب" کے نام سے تمام مستند اور غیر مستند تصاویر مع تعارف کے شائع کرا دی ہیں۔

[3] صحیح املا "اِن شاء اللہ" ہے کیوں کہ "اِن" حرف ہے "شاء" فعل۔ "اِن" کو ملا کر لکھنے سے "انشاء" کے معنی بدل جائیں گے۔

"ملک اضافت" (ص ۱۴) یہ نئی ترکیب ہے۔ قایل (ص ۱۶) "رزدہ" (ص ۱۸) دو جگہ آیا ہے اور "زدہ" درکار ہے۔ مضایقہ (ص ۲۰) فرایض (ص ۴۶) مسایل (ص ۵۲) "انقلاب وارد ہوا" (ص ۶۸) "فی زمانہ" (ص ۴۸) دقایق (ص ۸۲) سُنے گیے (ص ۸۴) "کچھ دیواریں اور کھپریل" (۸۴) "کچی دیواریں" چاہیئے۔ "گماں یہ گزرتا تھا کہ کٹکر ہے اور صبح کو پھانسی ملے گی" (ص ۸۶) اصل عبارت یوں ہے "گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹگر ہے اور صبح کو مجھے پھانسی ملے گی"[1] ضایع (ص ۱۰۰) طبایع، صنایع، بدایع، لایق (ص ۱۱۲) "اس کے شرخ سے صبح کا دھوکا نہ کہا مرغ سحر" (ص ۱۱۳) "کہ خاموشی سے فایدہ اخفایے حال ہے" (ص ۱۲۶) "محبت پیش کان" (ص ۱۲۸) دہ ہر دو جال (ص ۱۴۳) اپنے مسلک کی زندی (۱۵۰) عرایض، مسایل، آگیے (۱۵۱) یہ خط و کتابت ۱۲۵۴ء سے ۱۲۵۶ء تک جاری رہی (ص ۱۴۳) زایل (۱۵۷) حقایق (۱۵۸) وغیرہ

(۴) قاضی عبد الودود صاحب نے ایک جگہ غالب پر اعتراض کیا ہے کہ وہ عربی سے اتنے نابلد تھے کہ ضمیر مذکر و مونث تک کی تمیز نہ تھی۔ چناں چہ انھوں نے ایک جگہ اپنی والدہ کو "مدظلہ العالی" اور دوسری جگہ ملکہ وکٹوریہ کے لیے "خلّد اللہ ملکہ" لکھا ہے[2] غالب کے تتبع میں اس "غالب نمبر" نے بھی یہ غلطی کی ہے۔ شذرات کے بعد مدح کے کچھ اشعار دیے ہیں جن کے عنوان میں "آنسہ اسما سعیدی" کو "مُسلّم" لکھا گیا ہے (ص ۱۹)

(۵) اضافت کا عام قاعدہ ہے کہ اگر مضاف کے آخر میں حرفِ علّت یا ہمزہ نہ ہو تو اسے کسرہ دیا جائے گا جیسے "نظرِ کرم" میں نظر کی "ر" پر زیر آگیا لیکن حرفِ علّت ہونے کی صورت میں علامتِ اضافت یعنی زیر کو "ی" سے ظاہر کیا جاتا ہے جیسے علمائے "علمائے کرام" "قوّتِ قوی" وغیرہ۔ اس اصول پر اساتذہ بڑی سختی سے کاربند رہے ہیں اور غالب نے بھی اپنے ایک خط میں ایک شاگرد کو ایسی غلطی پر ٹوکا ہے۔ زیرِ نظر رسالے میں یا تو ہمزہ کا اتنا التزام ہے کہ "آئے، جائے، کھائے" اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ جن پر ہمزہ درکار ہے وہاں سے بھی ندارد کر دیا یا "از روی فرمان، دنیای اسلام اور ناخدای سخن" جیسی تراکیب میں بھی ہمزہ موجود ہے جہاں ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔

(۶) "ہندستان" اور "ہندوستان" کے املا پر بحث بہت ہو چکی ہے بعض کے نزدیک دونوں صورتیں درست ہیں اور بقول بعض ایک — میں خود "ہندستان" (بغیر واؤ) کا حامی ہوں۔ مگر اس رسالے میں دونوں طرح دیا ہوا ہے۔ کسی ایک املا کی پابندی مناسب تھی۔ خواہ دونوں طرح درست ہو۔

اصولِ املا کے لحاظ سے "گئے، نئے" وغیرہ میں ہمزہ چاہیئے، ی کے نقطے درکار نہیں، مگر "لیے، پیے، جیے" وغیرہ میں ہمزہ بے کار ہے۔ رسالے میں اکثر جگہ خلاف ورزی کی گئی ہے۔

(۷) غالب کے سلسلے میں متفرق کتابوں اور اخباروں سے اہم اقتباسات دیئے گئے ہیں مگر اس طرح،

"خواجہ احمد فاروقی بحوالہ روزنامچہ جیون لال ورق ۳۸۔ الف و ب" یا "خواجہ احمد فاروقی بحوالہ گلدستۂ نازنینان" وغیرہ۔ ایسے مواقع پر مرتب نے اپنا نام درج کرنا کیوں ضروری سمجھا ہے یہ معاملہ حل نہ ہو سکا۔ کیا "روزنامچہ جیون لال"، "دہلی اردو اخبار" اور "گلدستۂ نازنیناں" اُن کی تصانیف کے نام ہیں اگر ایسا ہے تو صراحت ضروری تھی۔

(۸) فارسی اور ہندی یا ہندی اور ہندی الفاظ کے مابین واوِ عطف کا داخلہ ممنوع ہے مثلاً یوں نہیں کہیں گے "پیالہ و گھڑا" یا "پیار و پریم" اگرچہ پہلی صورت میر کے ہاں ملتی ہے ع "بہتیری باتیں ہوئی ہیں اخلاص و پیار کی" یا "جامۂ مستیٔ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا" لیکن اُس وقت زبان "ان گھڑ" تھی اور بقول حاتم "سر کو دھڑ کا قافیہ" باندھ دیتے تھے بعد میں اساتذہ نے ایسی ترکیبوں کو نکال باہر کر دیا۔ اس رسالے میں ان معمولی باتوں کا لحاظ بھی نہیں رکھا گیا۔ "چھٹی و ساتویں و آٹھویں" (ص ۹۹) اسی کی مثال ہے۔ ایک جگہ "جائے رہایش" کی ترکیب بھی ملتی ہے مثلاً تو "جائے" پر ہمزہ غلط، پھر رہائش کو "ی" سے لکھنا غلط۔ آخر میں پوری ترکیب ہی "رہائش"

---

[1] اردوے معلیٰ (خطوطِ غالب) / ۲۹۸

[2] نقدِ غالب، مرتبہ مختار الدین احمد / ۵۲۵

عربی نہ فارسی نہ ترکی ——— یہ کچہری کے محرّروں کی زبان ہے اور علمی رُتبے سے فروتر۔

(۹) "غالب نے ایک ایرانی کی صحبت و شاگردی اختیار کی" (ص ۶۷) اگر اس ایرانی سے ملا عبدالصمد مراد ہے تو اس کا خارجی وجود مشتبہ ہے[1]۔ اگر نئی تحقیق سے اُس کا وجود خارجی ثابت ہو چکا ہے تو اس کی صراحت ضروری تھی۔

(۱۰) غالب کی قیام گاہوں کے سلسلے میں "گلی قاسم جان کے املی والے پھاٹک" کو (تصویر نمبر ۶) نواب الٰہی بخش خاں معروف کا مکان بتایا ہے، یہ ثبوت کا محتاج ہے۔ اس معاملے میں حمیدہ سلطان صاحبہ کے بیان کو بطور سند پیش کیا ہے وہ معروف کی ہم عصر نہیں ہیں : اُن کی شہادت قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ اسی مکان میں غالب کی شادی ہوئی تھی۔ ثبوت درکار ہے۔ اصلاً یہ مکان نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کے والد (نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں) کا بنوایا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس مکان میں بگا بیگم کی شادی ہوئی ہو۔

(۱۱) اسی محوّلہ بالا مضمون میں ایک فارسی عبارت اردوئے معلّیٰ کے صفحہ ۴۱۰ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے (ص ۷۰) مگر اصل کتاب پر حاضر ہے اور کلیاتِ نثرِ غالب میں موجود ہے۔

آفاق دہلوی مرتب "نادراتِ غالب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالب قمار خانہ قائم کرنے کے الزام میں کالے صاحب کے مکان سے گرفتار ہوئے تھے۔ اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ غلط ہے کالے صاحب کے مکان میں غالب اواخر جولائی ۱۸۴۷ء میں آئے ہیں مگر مضمون نگار نے مئی ۱۸۴۷ء لکھا ہے۔

اسی طرح حکیم محمود خاں والے مکان کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے تشنہ ہے۔ چند باتیں قابلِ غور ہیں :

الف) غالب کالے صاحب کی حویلی سے اٹھ کر حکیم محمود خاں کے بھائی (حکیم محمد حسن خاں) کے مکان میں آ رہے تھے اور یہ مکان اُس سے بالکل مختلف ہے جو مضمون نگار نے ظاہر کیا ہے۔ بازار ملیاران میں حویلی حسام الدین کے سامنے جو مکان ہے اس سے متصل چھوٹی سی گلی میں جسے غالب نے "تنگ نا" کہا ہے محمد حسن خاں کی حویلی تھی جس کا بیشتر حصہ منہدم ہو کر دوبارہ تعمیر ہو چکا ہے[2]۔

ب) مضمون نگار نے "کروڑا والی حویلی" کا محلِ وقوع "ہمدرد دواخانے کے سامنے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر" بتایا ہے دراں حالیکہ یہ "بائیں ہاتھ" پر واقع ہے اور اب اصل حالت میں محفوظ نہیں۔

ج) "اسماعیل خاں کا مکان" کے عنوان سے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ یہ مکان "گلی قاسم جان کے اس نکڑ پر واقع تھا جو بلی ماران کی طرف ہے اس مکان کے سامنے ہندستانی دواخانہ ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ جہاں اب ہندستانی دواخانہ ہے یہاں پہلے حکیم محمود خاں کی بہن کا مکان تھا جو حکیم مظفر حسین خاں سے بیاہی تھیں۔ حکیم مظفر خاں ٹونک چلے گئے تھے۔ اُن کے اس مکان میں غالب کا زنان خانہ تھا۔ مسجد کے عقب میں غالب کے رہنے کا مکان تھا جسے "مردانہ مکان" کہہ سکتے ہیں۔ یہ حویلی بہت بڑی تھی جب ورثا میں تقسیم ہوئی تو حکیم اجمل خاں کے حصے میں اصطبل بنوالیے گئے تھے وہ بعد میں اُن کے صاحبزادے حکیم جمیل خاں نے فروخت کر دیا ہے۔ حکیم واصل خاں اور حکیم عبدالمجید خاں کے حصے کا مکان ابھی کم و بیش اپنی پہلی حالت پر موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسماعیل خاں سے اس مکان کو کچھ علاقہ نہیں۔

د) انھوں نے لکھا ہے کہ غالب کی "ولادت یقیناً اُن کے ننھیال ہی میں ہوئی[3]"۔ غالب کی کسی تحریر سے اس "یقیناً" کی تائید نہیں ہوتی۔ مالک رام صاحب نے اگرچہ ایسا خیال ظاہر کیا ہے[4] لیکن "یقیناً" وہ بھی نہیں کہہ سکتے۔

---

[1] دیکھو احوالِ غالب مرتبہ مختارالدین احمد (مقالۂ قاضی عبدالودود) [2] جس مکان میں آج کل سلطان یار خاں وکیل رہتے ہیں یہی مومن خاں کی حویلی کا ایک حصہ تھا اور اس کے ڈانڈے وہاں تک تھے جہاں اب حکیم عبدالحیٔ انصاری کا مطب اور اس کے نیچے ایک ہوٹل ہے۔

[3] اردوئے معلّیٰ غالب نمبر ص ۵ [4] ذکرِ غالب ص ۲۱

(۱۱) "غالب نے ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) سے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی[1]"

یہ سال قطعیت کے ساتھ متعین نہیں کیا جاسکتا۔ وہ شادی سے پہلے بھی دہلی آتے جاتے تھے "اور شادی کے معاً بعد یہاں دہلی میں مقیم نہیں ہوئے۔ اگر ملا عبدالصمد کا خارجی وجود تسلیم کرلیا جائے تو غالب نے بقول خود ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰-۱۸۱۱ء) میں اس سے ملاقات کی اور دو برس اپنا مہمان رکھا۔ اور یہ آگرے کے زمانہ قیام کی بات بتاتے ہیں۔ اس لئے خود اُن کا ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۲-۱۸۱۳ء) تک آگرے میں ہونا تو بہرحال ثابت ہے[2]"

اس میں شبہ نہیں کہ جناب خلیق انجم نے، جو ایک نوجوان ادیب اور نقاد ہیں، بڑی محنت سے یہ مضمون لکھا ہے لیکن بعض پہلو تفصیل طلب رہ گئے ہیں اور یہ معمولی سی فروگزاشتیں کھٹکنے لگتی ہیں۔

(۱۲) ڈاکٹر گیان چند جین نے "غالب اور بھوپال" کے عنوان سے دو انکشافات کیے ہیں۔ ایک تو غالب کی وہ غزل جس کا مقطع ہے:

پیرانہ سال غالبؔ مے کش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

جعلی ثابت کی ہے دوسرے نسخۂ حمیدیہ کے غائب ہونے کی کہانی بتائی ہے۔ جس وقت جناب مالک رام دیوان غالب مرتب کر رہے تھے اور اس غزل کو شامل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے میں نے بھی شبہ ظاہر کیا تھا کہ غالب کی کسی تحریر سے یا کسی دوسرے ماخذ سے ان کا بھوپال جانا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر انھوں نے یہ فرمایا کہ غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ہیں اور اُن کے خطوط ۱۸۴۹ء سے ملنا شروع ہوتے ہیں ۵۲ برس کی اس طویل مدت میں صرف ان کے سفر کلکتہ اور چند دوسرے واقعات کا علم ہوتا ہے اور آدھی صدی کے کتنے ہی اہم واقعات ہماری دسترس میں نہیں ہیں اس لیے یہ ممکن ضرور ہے کہ وہ کبھی بھوپال جانکلے ہوں۔ خارجی شواہد کی روشنی میں یہ بات اتنی مستبعد بھی نہیں تھی' اور اس وقت غزل کے جعلی ہونے کا ثبوت بھی نہیں ملا تھا' اس لیے اُن کا اس غزل کو دیوان میں شامل کرلینا کچھ ایسا ناروا بھی نہیں تھا اس کے جعلی ہونے کی داستان دیوان طبع ہونے کے بعد معلوم ہوئی ہے۔ حضرت مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی اپنے مرتبہ دیوان میں اس غزل کو شامل کیا ہے[3] اس سے ان بزرگوں پر غیر ذمہ داری کا الزام لگانا زیادتی ہے۔

اسی مضمون میں بڑی احتیاط کے ساتھ "نسخۂ حمیدیہ" کے غائب کرنے کا الزام بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پر لگا دیا گیا ہے۔ میں اس بارے میں کیا عرض کرسکتا ہوں الحمدللہ مولوی عبدالحق ابھی سلامت ہیں وہ خود تردید یا توثیق کرسکتے ہیں۔

(۱۳) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے، جو اردو کے ذہین نقاد اور بالغ نظر محقق ہیں، "غالب کا ایک نیا خط" کے عنوان سے سخاوت حسین مدہوش بدایونی کے نام غالب کا ایک خط پیش کیا ہے جو سب سے پہلے رسالہ "سراج سخن" میں شائع ہوا تھا اور خطوط غالب کے کسی مجموعے میں نہیں آسکا ہے۔ یہی خط جناب فرخ جلالی نے ضروری تمہید کے ساتھ 'آج کل' (غالب نمبر، فروری ۱۹۶۰ء) میں شائع کرا دیا ہے۔ نارنگ صاحب نے اس پر صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ رسالہ سراج سخن کے بارے میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے یہ اہم ہے مگر غالبیات کے سلسلے میں بالکل غیر متعلق سی بات ہے۔

(۱۴) کوئی صاحب محمد ذاکر ہیں۔ انھوں نے "دیوان غالب کا پہلا اور آخری مطبوعہ نسخہ" سامنے رکھ کر اختلافات کی نشان دہی کی ہے پہلے نسخے سے مراد مطبع سید الاخبار والا ۱۸۴۱ء کا ایڈیشن ہے اور آخری ایڈیشن "دیوان غالب نسخۂ عرشی" کو قرار دیا ہے۔ (حالانکہ دیوان غالب کے

---

[1] اردوئے معلی غالب نمبر ۱/۷۱
[2] غالب کی قیام گاہوں کے سلسلے میں میرا ماخذ حکیم محمد کامل خاں صاحب ہیں جو شریف منزل بلیماران دہلی میں رہتے ہیں اور شریف خانی خاندان کے معزز فرد ہیں۔
[3] دیوان غالب نسخۂ عرشی /۳۰۲

ہند ایڈیشن نسخۂ عرشی کے بعد بھی چھپ چکے ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کی نیت عرشی صاحب کو متہم کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اُن کی تحقیق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے لکھتے ہیں:

"سرسید نے آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں اسی چھاپے خانے سے شائع کیا تھا لیکن آثار الصنادید پہ مطبع کا نام مطبع سیّد الاخبار نہیں بلکہ سیّد المطابع درج ہے۔"

یہ عبارت موصوف نے "ہندستانی اخبار نویسی" سے نقل کر لی ہے خود آثار الصنادید کی زیارت نہیں کی جس کی طبع اول کے پہلے ہی صفحے پر جلی قلم سے:

"در مطبع سیّد الاخبار باہتمام سید عبد الغفور بقالب طبع در آمد۔"

لکھا ہوا ہے۔ جہاں انھوں نے عرشی صاحب کے بیان کردہ پندرہ سطری مسطر کی تغلیط کی ہے وہاں یہ بھول گئے ہیں کہ مسطر میں مکتوبی اور غیر مکتوبی دونوں ہی سطریں شمار ہوتی ہیں۔ عرشی صاحب کا بیان غلط نہیں ہے۔ انھوں نے صولت پبلک لائبریری رامپور کے نسخے سے فائدہ اٹھایا ہے اور یہ نسخہ راقم الحروف نے بھی دیکھا تھا۔

مقالہ نگار نے ایک ایسا اعتراض کیا ہے جس پر ہنسی آتی ہے یعنی غالب کے دیباچۂ دیوان میں عبارتیں پیراگراف کی صورت میں نہیں تھیں اور اعراب و اضافتیں بھی نہیں دی گئیں۔ عرشی صاحب نے ایسا کیا ہے گویا "بدعت" کر کے غالب کے دیباچے کا مطلب ہی فوت کر دیا ہے۔ لیکن موصوف کو شاید علم نہیں کہ غالب کے دیباچے ہی پر موقوف نہیں اُس زمانے کی اور اُس کے بعد بھی ۲۵-۳۰ برس کے عرصے میں چھپی ہوئی کسی کتاب پر وہ اعراب یا باقاعدہ پیراگراف اور رموز و اوقاف نہیں دکھا سکتے۔ اِن کا رواج پنجاب میں تعلیمات کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائڈ وغیرہ کی کوششوں سے ہوا ہے اور موجودہ آداب تحریر میں ان کا لحاظ بے حد ضروری ہے۔ عرشی صاحب نے اگر اسے رموز و اوقاف اور اعراب و اضافت کے ساتھ پیراگراف میں تقسیم کر کے نقل کیا ہے، تو یہ بات قابل تعریف ہے نہ کہ قابل اعتراض۔

رہا صحیح تعداد اشعار کا معاملہ تو یہ ایسا نہیں کہ اس پر اتنی طویل بحث کی جائے۔ سیدھی سی بات ہے کہ پہلے ایڈیشن میں جتنے اشعار ہیں انھیں شمار کر لیا جائے اور وہی صحیح تعداد ہے۔ عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی کے دیباچے میں ہر ردیف کے اشعار کی صحیح تعداد پیش کر دی ہے اُس کی تغلیط اسی وقت ممکن ہے جب مضمون نگار ہر ردیف کے اشعار کی صحیح تعداد خود شمار کر کے پیش کرتے۔

اختلافاتِ نسخ کی نشان دہی میں بھی انھوں نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ ۱۸۴۱ء کے بعد خود غالب کی زندگی میں اُن کے دواوین کے متعدد ایڈیشن چھپے ہیں اور اُن میں غالب نے ردّ و بدل بھی کیا ہے اس لیے صحیح متن وہ سمجھا جائے گا جو غالب کی نظر سے آخری بار گذر کر چھپا۔ اگر ۱۸۴۱ء کے نسخے میں کچھ باتیں متداول دواوین سے مختلف ہیں تو ان کی نوعیت ایک مضمون کے مسالے کی ہو سکتی ہے مگر اُن کی بنیاد پر دیوان کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

(۱۵) جناب خواجہ احمد فاروقی کے اِس مجموعے میں متعدد مضامین ہیں۔ پہلا مضمون "غالب کے ایک شاگرد مولانا بیدل" پر لکھا گیا ہے۔ مگر اُن کی تصانیف کا پورا تعارف نہیں کرایا۔ عبد السمیع بیدل کا وطن "رامپور ضلع سہارن پور" دواوین میں لکھا ہے مگر اس طرف اشارہ نہیں کیا کہ یہ ریاست رامپور سے مختلف ایک مقام ہے۔ بظاہر مضمون نگار کو اس کا علم نہیں ورنہ وہ مالک رام پر یہاں بھی اعتراض کرتے۔

عبد السمیع بیدل کی سب تصانیف کے "پیش نظر" ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن قریب بہ یقین ہے کہ بعض تصانیف جن کا سرسری تعارف کرایا گیا ہے اُن کے سامنے نہیں ہیں اور یہ معلومات کسی دوسرے ذریعے سے اخذ کر کے دی گئی ہیں۔ مثلاً "حمد باری" کے ذیل میں لکھا ہے:

"بیان لغات میں منظوم رسالہ۔ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۳۱۲ھ۔ تعداد صفحات ۳۲۔ ابتدا

سیل ہے رد اور نالا اسے دہیر
ندی اد غاب اور تالاب آب گیر" (ص ۱۱۲)

ہمارے سامنے حمد باری کا جو ایڈیشن ہے وہ ۱۲۹۵ھ میں مطبع قاسمی [illegible] ..." اس کا مقدمہ [illegible]
تین صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ تلخیص ملاحظہ ہو:
"کہتا ہے ... عبد السمیع رامپوری کہ جس وقت .... شیخ الٰہی بخش کے چھوٹے بھائی حقیقی یعنی ... حافظ عبد الکریم صاحب کے فرزند ... وحید الدین نے فارسی پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع کی خالق باری شروع کی۔ اس کتاب کے بعض الفاظ پنجابی اور سنسکرت اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے .... تب میں نے ... بیان لغات میں یہ رسالہ ... لکھا .... وقت تالیف رسالہ چند نسخ معتبرہ .... مثل صراح و انفس و برہان قاطع و غیاث اللغات و نفائس اللغات اس عاجز کے پیش نظر رہتے تھے .....
اگر کسی صاحب کو شبہ و اشکال ہو .... تو ... مجھ کو تیر ملامت کا نشانہ نہ بناویں بلکہ اولاً حواشی رسالہ ہذا ... ملاحظہ فرماویں
...." (مقدمہ، حمد باری)
تین صفحوں کے اس مقدمے کے بعد اصل رسالہ شروع ہوتا ہے جس میں پہلے حمد ہے۔ ابتدا:

حمد باری لکھ کے اور نعتِ رسول
جو لکھے بیدل کرو دل سے قبول
ہے خدا اللہ پیغمبر رسول
ہے صحابی جس کو ہو صحبت حصول

پھر "فصل دربیان آسمان و متعلقاتِ آں" (ص ۶) اس کے بعد "فصل دربیانِ سال و ماہ وغیرہ" (ص ۷) پھر "فصل دربیانِ زمین و آنچہ دران است از معادنِ و بحار و اماکن وغیرہ" (ص ۸) اِس فصل میں چھ شعروں کے بعد ساتواں شعر یہ آتا ہے جسے ڈاکٹر فاروقی نے اپنے مضمون میں "ابتدا" کا شعر بتایا ہے۔

بیل ہے رہ اور نالا اسے دبیر
ندی ارغاب اور تالاب آب گیر (حمد باری ص ۹)

یہ خالق باری کے طرز کا مختصر سا رسالہ ہے اس کے حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح اختراماً ہوئی نے کی ہے۔ حافظ محمود شیرانی خالق باری کے مقدمے میں اس رسالے کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے بیدل کی تصانیف "کو ملاحظہ نہیں فرمایا، کسی اور ذریعے سے معلومات اخذ کی ہیں۔ ورنہ وہ اس کے مندرجات سے ہمیں صحیح طور پر مطلع فرماتے۔"

ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ مضامین لکھتے وقت فاضل مضمون نگار نے اپنی توجہ دوسری جہات پر مرکوز رکھی ہے انھوں نے جناب مالک رام پر غلط حوالہ دینے، غلط بیانی کرنے اور تحقیقی غلطیوں کا ارتکاب کرنے کی فردِ جرم عائد کی ہے[1] اِس طرح گویا اُس احتجاج کا "الزامی جواب" دیا ہے جو مالک رام نے رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں شائع شدہ مضمون "غالب کا ایک شعر" میں نامکمل اور گمراہ کن حوالہ دینے پر کیا تھا[2] لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جتنے الزام انھوں نے مالک رام پر لگائے ہیں اُسی نوعیت کی تمام تر غلطیاں خود اپنے مضامین میں بھی کی ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ "تلامذۂ غالب" میں بعض تاریخی اور تحقیقی غلطیاں ہیں[3] لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ انھوں نے یہ کتاب قاہرہ (مصر) میں بیٹھ کر لکھی تھی جہاں ظاہر ہے کہ اردو کا کوئی بڑا کتب خانہ نہیں ہے نہ وہاں اردو میں تحقیقی کام کرنے کے لیے وسائل میسر آ سکتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو اردوئے معلیٰ، صفحات ۹۲، ۹۹، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، وغیرہ
[2] معارف (اعظم گڑھ) اگست ۱۹۵۹ء
[3] ملاحظہ ہو میرا مضمون "تلامذۂ غالب پر ایک نظر" نقوش (لاہور) دسمبر ۱۹۵۹ء

اعتراض صرف یہ ہے کہ تحقیقی اور تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کے وقت "نیت بخیر" ہونی چاہیئے۔

(۱۲) یہی حال فاروقی صاحب کے "غالب اور بے صبر" والے مضمون کا ہے۔ اس ضمن میں جتنی معلومات پیش کی ہیں وہ رسالہ اردو ادب
(علی گڑھ) رسالہ نیا دور (لکھنؤ) اور رسالہ نقوش (لاہور) سے اخذ کی گئی ہیں لیکن ایک رسالے کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ جناب معراج دھولپوری
پر بہا سروپ کی لکھی ہوئی "سوانح عمری بے صبر" تلامذۂ غالب کی اشاعت کے بعد دریافت کی ہے اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ نو دریافت ہے
راقم اس کے ذمّہ دار نہیں ہو سکتے۔ آداب تحقیق سے واقفوں کو یہ معمولی سی بات معلوم ہے کہ جو ماخذ معروف و مشہور جعل یا مقاصد نگار جیسے
مفادے کا مدّعی ہو صرف انھیں کی روشنی میں اس کے بیانات کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر میرے پاس کوئی ایسی مستند قلمی دستاویز ہو جس
غالب کا ہاشمی سید ہونا ثابت ہو جائے تو اُس سے پہلے چھپنے والی کتابوں کے مصنفوں پر اتہام بد دیانتی یا کتمانِ حقیقت کا لگانا کھلی
زیادتی ہوگی۔

میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ فاروقی صاحب نے "سوانح عمری بے صبر" کہاں دیکھی ہے؟ اگر انھوں نے رسالہ اردو ادب ہی سے
سب باتیں اخذ کی ہیں تو مضمون نگار جناب معراج دھولپوری کا نام کیوں نظر انداز کیا گیا ہے۔

"غالب اور بے صبر" کے عنوان سے بارہ صفحوں کے اس مضمون میں 'بے صبر' کے چند غیر مطبوعہ اشعار کے سوا کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوتی۔
ہندستانی ماحول" وغیرہ کی بحث بالکل فضول ہے۔ اس کا غالب نمبر میں قطعاً موقع نہ تھا۔

(۱۷) ایک اور مضمون میں" غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات حضرت غمگین کے نام" خواجہ احمد فاروقی صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ان
خطوط کا سُراغ سب سے پہلے محمد یونس خالدی صاحب نے لگایا تھا وہ غالباً حضرت غمگین پر کوئی کتاب بھی لکھ رہے ہیں۔ غمگین کے بارے میں مختلف
رسائل میں رسالہ فاران (کراچی) رسالہ ہمہ نیمروز (کراچی) اور رسالہ آج کل (دہلی) نیز رسالہ اردو (کراچی) اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مضامین
شائع ہو گئے ہیں۔ اُن کے حالات کے سلسلے میں خواجہ صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی سوائے اس کے کہ چند غیر معروف اور بعض غیر اہم
ماخذوں کے حوالے دینے کا التزام کیا ہے۔ غمگین اور اُن کے خاندان کے حالات اب سے چوتھائی صدی قبل "سیرت الصالحین" کے نام
سے آگرہ اخبار پریس آگرے سے شائع ہو چکے ہیں۔ ظاہراً مضمون نگار کو اس کا مطلق علم نہیں۔
غمگین کے نام غالب کے جو خطوط پیش کیے ہیں اُن کے مطالب کی روشنی میں ایک نہایت وقیع مضمون جناب میکش اکبر آبادی کا لکھا
رسالہ آج کل دہلی (فروری ۱۹۶۰ء) میں شائع ہو چکا ہے اس سے ان خطوط کے مطالب اور مندرجات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ خواجہ صاحب
چونکہ تصوف کے مردِ میدان نہیں نہ اُس کی اصطلاحوں سے واقف ہیں اس لیے انھوں نے صرف فارسی متن بلا ترجمہ درج کر دیا ہے (اس میں
بھی فاحش غلطیاں کی ہیں) ان خطوط کے پیش کرنے کا انداز بھی عجیب ہے۔ دوسری بات یہ کہ رسالہ اردو (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں خطوط کا
متن پیش کیا گیا ہے اس سے مقابلہ کرنے پر بعض اختلافات بہت اہم نظر آتے ہیں اب خدا جانے کہ صحیح متن کون سا ہے جو اردو (کراچی)
میں چھپا ہے یا جسے اردوئے معلّیٰ میں پیش کیا گیا ہے۔ بظاہر "اردو" کا متن قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔
(۱۸) ڈاکٹر یان ماریک چیکوسلواکیہ میں اردو پڑھاتے ہیں۔ اِن کے مضمون کا عنوان ہے "چیک زبان میں دیوان غالب کا ترجمہ" یہ
اخبار انداز کا ہے اور ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

اب چند باتیں عمومیت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔ یونی ورسٹی سے اردو کا تحقیقی رسالہ ہی اگر شائع کرنا ہے تو اس کے لیے بہت سے
بیہودہ گوشے باقی ہیں اُن پر صحت اور جامعیت کے ساتھ کام کیا جا سکتا ہے مثلاً مومن خاں کا فارسی کلام ابھی تک [illegible]
اس کے کلیات فارسی کا کوئی اچھا کیا برا [illegible] بازار میں دستیاب نہیں ہوتا اگر اس ضرورت کا احساس کیا جاتا تو زیادہ [illegible]
غالب کے سلسلے میں بہت کام ہو چکا ہے اور اب کسی نئی بات کے دریافت ہونے کا امکان بھی بہت ہی کم ہے بس یہی [illegible] اگر [illegible]

ہمارے سامنے حمد باری کا جو ایڈیشن ہے وہ ۱۲۷۸ھ میں طبع ہوا [illegible] وقت سے چھپا ہے جو تین صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ تلخیص ملاحظہ ہو:

"لکھتا ہے ... عبدالسمیع رامپوری کہ جس وقت .... شیخ الٰہی بخش کے چھوٹے بھائی حقیقی یعنی ... حافظ عبدالکریم صاحب کے فرزند ... وحیدالدین نے فارسی پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع کی خالق باری شروع کی۔ اس کتاب کے بعض الفاظ عربی اور سنسکرت اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے ... تب میں نے ... بیان لغات میں یہ رسالہ ... لکھا ... وقت تالیف رسالہ چند نسخ معتبرہ .... مثل صراح و قاموس و برہان قاطع و غیاث اللغات و نفائس اللغات اس عاجز کے پیش نظر رہتے تھے .... اگر کسی صاحب کو شبہ و اشکال ہو .... تو ... مجھ کو تیر ملامت کا نشانہ نہ بناویں بلکہ اولاً حواشی رسالہ ہذا ... ملاحظہ فرماویں .... " (مقدمہ، حمد باری)

تین صفحوں کے اس مقدمے کے بعد اصل رسالہ شروع ہوتا ہے جس میں پہلے حمد ہے۔ ابتدا:

حمد باری لکھ کے اور نعتِ رسول
جو لکھے بیدل کرو دل سے قبول
ہے خدا اللہ پیغمبر رسول
ہے صحابی جس کو ہو صحبت حصول

پھر "فصل دربیان آسمان و متعلقاتِ آں" (ص ۶) اس کے بعد "فصل دربیانِ سال و ماہ وغیرہ" (ص ۷) پھر "فصل دربیانِ زمین و آنچہ دراں است از معادن و بحار و اماکن وغیرہ" (ص ۸) اس فصل میں چھ شعروں کے بعد ساتواں شعر یہ آتا ہے جسے ڈاکٹر فاروقی نے اپنے مضمون میں "ابتدا" کا شعر بتایا ہے۔

نیل ہے رو اور نالا اے دبیر
ندی ارغاب اور تالاب آب گیر (حمد باری ص ۹)

یہ خالق باری کے طرز کا مختصر سا رسالہ ہے اس کے حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح اختر امروہوی نے کی ہے۔ حافظ محمود شیرانی خالق باری کے مقدمے میں اس رسالے کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے بیدل کی تصانیف "کو ملاحظہ نہیں فرمایا، کسی اور ذریعے سے معلومات اخذ کی ہیں۔ ورنہ وہ اس کے مندرجات سے ہمیں صحیح طور پر مطلع فرماتے۔"

ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ مضامین لکھتے وقت فاضل مضمون نگار نے اپنی توجہ دوسری مہمات پر مرکوز رکھی ہے انھوں نے جناب مالک رام پر غلط حوالے دینے، غلط بیانی کرنے اور تحقیقی غلطیوں کا ارتکاب کرنے کی فردِ جرم عائد کی ہے[1] اس طرح گویا اُس احتجاج کا "الزامی جواب" دیا ہے جو مالک رام نے رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں شائع شدہ مضمون "غالب کا سکّۂ شعر" میں تاسکّل اور گمراہ کن حوالے دینے پر کیا تھا[2] لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جتنے الزام انھوں نے مالک رام پر لگائے ہیں اُسی نوعیت کی تمام تر غلطیاں خود اپنے مضامین میں بھی کی ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ "تلامذۂ غالب" میں بعض تاریخی اور تحقیقی غلطیاں ہیں[3] لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ انھوں نے یہ کتاب قاہرہ (مصر) میں بیٹھ کر لکھی تھی جہاں ظاہر ہے کہ اردو کا کوئی بڑا کتب خانہ نہیں ہے نہ وہاں اردو میں تحقیقی کام کرنے کے لیے وسائل میسر آسکتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو اردوئے معلّیٰ، صفحات ۹۲، ۹۹، ۱۰۹، ۱۱۰، وغیرہ

[2] معارف (اعظم گڑھ) اگست ۱۹۵۹ء

[3] ملاحظہ ہو میرا مضمون "تلامذۂ غالب پر ایک نظر" نقوش (لاہور) دسمبر ۱۹۵۹ء

میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ تحقیقی اور تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کے وقت غیر جانب داری ملحوظ ہونی چاہیے۔

(۱۶) یہی حال فاروقی صاحب کے "غالب اور بے صبر" والے مضمون کا ہے۔ اس ضمن میں جتنی معلومات پیش کی ہیں وہ رسالہ اردو ادب (علی گڑھ) رسالہ نیا دور (لکھنؤ) اور رسالہ نقوش (لاہور) سے اخذ کی گئی ہیں لیکن ایک رسالے کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ جناب معراج دھولپوری نے یہ بہاسروپ کی لکھی ہوئی "سوانح عمری بے صبر" تلامذۂ غالب کی اشاعت کے بعد دریافت کی ہے اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ نودیانت بے مالک رام یا اُس کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ آداب تحقیق سے واقفوں کو یہ معمولی سی بات معلوم ہے کہ جو ماخذ معروف و مشہور ہوں یا مقالہ نگار جن سے استفادے کا مدعی ہو صرف انھیں کی روشنی میں اس کے بیانات کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر میرے پاس کوئی ایسی مستند قلمی دستاویز ہو جس سے غالب کا ہاشمی سید ہونا ثابت ہو جائے تو اُس سے پہلے چھپنے والی کتابوں کے مصنفوں پر اتہام بد دیانتی یا کتمانِ حقیقت کا لگانا کھلی ہوئی زیادتی ہوگی۔

میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ فاروقی صاحب نے "سوانح عمری بے صبر" کہاں دیکھی ہے؟ اگر انھوں نے رسالہ اردو ادب ہی سے یہ سب باتیں اخذ کی ہیں تو مضمون نگار جناب معراج دھولپوری کا نام کیوں نظر انداز کیا گیا ہے۔

"غالب اور بے صبر" کے عنوان سے بارہ صفحوں کے اس مضمون میں بے صبر کے چند غیر مطبوعہ اشعار کے سوا کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ "ہندستانی ماحول" وغیرہ کی بحث بالکل فضول ہے۔ اس کا غالب نمبر میں قطعاً موقع نہ تھا۔

(۱۷) ایک اور مضمون میں "غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات حضرت غمگین کے نام" خواجہ احمد فاروقی صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ان خطوط کا سراغ سب سے پہلے محمد یونس خالدی صاحب نے لگایا تھا وہ غالباً حضرت غمگین پر کوئی کتاب بھی لکھ رہے ہیں۔ غمگین کے بارے میں مختلف اوقات میں رسالہ نگاران (کراچی) رسالہ مہر نیمروز (کراچی) اور رسالہ آج کل (دہلی) نیز رسالہ اردو (کراچی) اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مضامین بھی شائع ہو گئے ہیں۔ اُن کے حالات کے سلسلے میں خواجہ صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی سوائے اس کے کہ چند غیر معروف اور بعض غیر اہم کتابوں کے حوالے دینے کا التزام کیا ہے۔ غمگین اور اُن کے خاندان کے حالات اب سے چوتھائی صدی قبل "سیرت الصالحین" کے نام سے آگرہ اخبار پریس آگرہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ ظاہرا مضمون نگار کو اس کا مطلق علم نہیں۔

غمگین کے نام غالب کے جو خطوط پیش کیے ہیں اُن کے مطالب کی روشنی میں ایک نہایت وقیع مضمون جناب بیکس اکبرآبادی کا لکھا ہوا رسالہ آج کل دہلی (فروری ۱۹۶۰ء) میں شائع ہو چکا ہے اس سے ان خطوط کے مطالب اور مندرجات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ خواجہ صاحب چونکہ تصوف کے مرد میدان نہیں نہ اُس کی اصطلاحوں سے واقف ہیں اس لیے انھوں نے صرف فارسی متن بلا ترجمہ درج کر دیا ہے لہٰذا یہی کئی فاحش غلطیاں کی ہیں۔ ان خطوط کے پیش کرنے کا انداز بھی عجیب ہے۔ دوسری بات یہ کہ رسالہ اردو (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں خطوط کا جو متن پیش کیا گیا ہے اس سے مقابلہ کرنے پر بعض اختلافات بہت اہم نظر آتے ہیں اب خدا جانے کہ صحیح متن کون سا ہے جو اردو (کراچی) میں چھپا ہے یا جسے اردوئے معلیٰ میں پیش کیا گیا ہے۔ نظر بظاہر "اردو" کا متن قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

(۱۸) ڈاکٹر یان ماریک چیکوسلواکیہ میں اردو پڑھاتے ہیں۔ ان کے مضمون کا عنوان ہے "چیک زبان میں دیوان غالب کا ترجمہ"۔ صحافیانہ انداز کا ہے اور ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

اب چند باتیں عمومیت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔ یونی ورسٹی سے اردو کا تحقیقی رسالہ ہی اگر شائع کرنا ہے تو اس کے لیے بہت سے نا بیمود گوشے باقی ہیں اُن پر صحت اور جامعیت کے ساتھ کام کیا جا سکتا ہے مثلاً مومن خاں کا فارسی کلام ابھی تک [illegible] ہے اس کے کلیات فارسی کا کوئی اچھا کیا بُرا [illegible] بازار میں دستیاب نہیں ہوتا اگر اس ضرورت کا احساس کیا جاتا تو زیادہ [illegible] غالب کے سلسلے میں بہت کام ہو چکا ہے اور اب کسی نئی بات کے دریافت ہونے کا امکان بھی بہت ہی کم ہے [illegible]

جانے والے اور نزدیک دور کی قرابت رکھنے والے زیر بحث لائے جائیں۔ یہ کام اگر کسی درجے میں بھی مفید ہیں تو ان پر جناب قاضی عبدالودود
باب مالک رام، جناب امتیاز علی خاں عرشی، جناب مختار الدین احمد آرزو وغیرہ بہت کچھ کر چکے ہیں اور کریں گے۔ تاریخ ادب اردو کے
بہت سے پہلو ابھی تاریکی میں ہیں بنیادی اور اہم کام یہ ہے کہ ہم تخلیقی فکر کا رجحان پیدا کریں۔ اور تحقیق میں یہ بھول بھلیاں دکھا کر موضوع
کو ناقابل فہم نہ بنائیں۔

جس وقت معاصر (حصہ ۹) میں "میر تقی میر، حیات اور شاعری" پر قاضی عبدالودود صاحب کی تنقید شائع ہوئی تھی ڈاکٹر فاروقی
نے لندن سے ایک خط جناب آل احمد سرور کو لکھا تھا اور وہ انھوں نے "ہماری زبان" (علی گڑھ) میں شائع کر دیا تھا۔ اصل عبارت سرِدست
پیش نہیں کر سکتا لیکن فاروقی صاحب کا مفہوم یہ تھا کہ فلاں ادارے میں "ریسرچ میتھڈالوجی" پر فلاں بزرگوار کا لیکچر سنا بے ساختہ
آپ (آل احمد سرور) یاد آ گئے۔ مقرر موصوف نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس چیز کی کوئی اہمیت نہیں کہ تیر جمعہ کے دن
پیدا ہوئے تھے یا ہفتے کو۔ یا نپولین کے گھوڑے کا رنگ کمیت تھا یا ابلق۔ اصل چیز سماجی رشتے اور تہذیبی عوامل ہوتے ہیں اور ان
کا سراغ لگانا اور اس رشتۂ غیر محسوس کا دریافت کر لینا دیدہ وری کی علامت ہے۔" میں ڈاکٹر فاروقی کے اس خیال سے متفق تھا لیکن
یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اردوئے معلّٰی کے اس شمارے میں عملی طور پر انھوں نے خود ہی اس نظریے کی تغلیط کر دی ہے۔ اس میں سارا
زور اس بات پر ہے کہ غالب کے دیوان میں صحیح تعداد اشعار کیا ہے، بے صبر کب پیدا ہوئے، تمکین کے نام غالب کے کتنے رقعات
ہیں اور تبدیل کی تصانیف دس ہیں یا کم و بیش ——— وغیرہ، ظاہر ہے کہ ان باتوں کا علاقہ سماجی عوامل یا تہذیبی رشتوں سے کیا
ہو سکتا ہے؟

ہمیں یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی اگر ہم یہ نہ دیکھتے کہ رسالہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے نکلا ہے اور شعبے کے صدر
اس کے ایڈیٹر ہیں جنھوں نے ایک سو ساٹھ صفحوں کے رسالے میں پندرہ جگہ اپنا نام درج کر کے رسالے کا اعتبار بڑھایا ہے پھر یہ رسالہ غالب
سے منسوب ہے جس کے پڑھنے والوں کا بڑا حلقہ اسے ذوق و شوق سے دیکھے گا۔ ظاہر ہیں اور ناواقف حضرات جو انگریزی اخباروں سے اردو
کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں ایسی ہی چیزوں سے متاثر ہو کر بے تکلف AN AUTHORITY ON THE POET
کا خطاب دے دیتے ہیں۔

"...... تبصرہ نگار عموماً مصنف کے نام سے (اگر وہ معروف و مشہور مصنف ہیں) مرعوب
ہو جاتے ہیں ...... اگر تصنیف عام پسند ہے تو اس کی لازمی طور پر تعریف ہوتی ہے
اگر کسی مشہور و معروف مصنف کے قلم سے نکلی ہے تو اس کی ستائش میں تبصرہ نگار کا
قلم رطب اللسان ہوتا ہے۔ اگر کسی ذی مرتبہ شخص کی فکر طبع کا نتیجہ ہے (خصوصاً ایسا
شخص جس سے کچھ صلے کی اُمید ہے) تو پھر اس کی مدح میں طویل قصیدے لکھے جاتے
ہیں۔ اگر اپنے ہم وطن، اپنے مخصوص حلقے کے کسی فرد یا اپنے کسی دوست کی
کمائی ہے تو پھر اُس کی تعریف و توصیف، مبالغہ آمیز تعریف و توصیف میں
رات کو دن اور دن کو رات ثابت کر دینا معمولی سی بات ہے۔"

(کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر)

عبدالرزاق بسمل

حیدرآبادیات (فی البدیہ شاعری)

۱- حیدرآباد میں جہاں اُستاد داغ کے یہاں روزانہ محفل شعر و سخن کا دور رہتا تھا- شاگردوں کے علاوہ اہل ذوق بھی جمع رہتے تھے- ایسے ہی ایک موقع پر ایک دوست نے ماڈرن ورما کی ایک تصویر دکھا کر فرمائش کی کہ استاد اس پر کوئی شعر ہو جائے منظر یہ تھا کہ ایک مرد نے اپنے ایک ہاتھ سے عورت کا دامن تھاما ہُوا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنا دل- چنانچہ اس وقت نواب عزیز یار جنگ داغ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور یہ داغ کے چہیتے شاگردوں سے تھے- چنانچہ تصویر دیکھ کر عزیز یار جنگ سے کہا لکھو۔

ہاتھ اپنے دونوں نکلے کام کے ‏ ‏ ‏ ‏ دل کو تھاما اپنا دامن تھام کے

۲- داغ اپنے احباب میں بیٹھے ہوئے شعر و سخن کی مجلس گرم تھی- ملازم کو کہا کہ جاؤ اختری جان کو بلا لاؤ (اختری جان چپار منیلد کے پاس رہتی تھی اُس دور میں نہایت مشہور تھی) چنانچہ ملازم نے آکر اختری جان کو داغ کا پیغام دیا- اختری نے سُن کر کہا- جاؤ کہہ دو میری بلا بھی نہ آئے گی- ملازم نے آکر یہ جواب دیا- داغ نے مکرر پوچھا کہ بی اختری نے کیا کہا؟ ملازم نے پھر دہرایا- داغ نے عزیز یار جنگ سے مخاطب ہو کر کہا لکھو:- ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی ‏ ‏ ‏ ‏ کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

چنانچہ اُسی وقت پوری غزل لکھوا دی

۳- ایک مرتبہ ابوالحمید آزاد ناظم عدالت کا شمار داغ کے شاگردوں میں ہوتا ہے- استاد کی خدمت میں حاضر تھے گرمی کا موسم تھا- پیاس معلوم ہوئی تو پانی طلب کیا- ایک لڑکی پانی لے آئی اور گلاس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی کہ ہوا سے اُس کے شانہ سے اوڑھنی ڈھلک گئی، اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ لیئے- اُستاد کو یہ ادا بے حد پسند آئی- فوراً آزاد سے کہا لکھو:-

بادِ صبا نے بھی نہ کیا مجھ کو بے حجاب ‏ ‏ ‏ ‏ سینہ پہ ہاتھ آ گئے جب شانہ کھل گیا

۴- سید رضی الدین کیفی حیدرآباد کے خوش فکر شاعر اور کافی شہرت کے مالک تھے- ابتداً انہوں نے سورج بھان میکش سے مشورہ سخن کیا- جب داغ حیدرآباد آئے تو ان کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور اپنا کلام داغ کو دکھلانے لگے- چنانچہ انہوں نے ایک عزیز دوست کو اور احباب کے ساتھ چائے پر بلوایا- سب وقت مقررہ پر آ گئے لیکن منیر کا انتظار تھا وہ نہ آئے بلکہ ایک چٹھی ملازم کے ذریعہ بھجوائی کہ میں علیل ہوں- اس وقت نہیں آ سکتا- کیفی نے جھلا کر چٹھی کی پشت پر لکھ دیا:-

نہ اب کیجئے وعدہ خدارا ہم سے ملنے کا ‏ ‏ ‏ ‏ مزاج اکثر اسی دن آپ کا ناساز رہتا ہے

۵- ایک اور موقعہ پر احباب کو دعوت دی- کیفی کو اپنے ایک دوست کا انتظار تھا کہ اس اثنا میں زور دار بارش شروع ہو گئی- مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگے

وہ اب کیا خاک آئے ہائے قسمت میں ترسنا تھا ‏ ‏ ‏ ‏ تجھے اے ابر رحمت آج ہی اتنا برسنا تھا

۶- کیفی کے ایک عزیز دوست نواز علی مست جو ان کے ہم محلہ تھے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے اور کیفی راستے سے گذر رہے

تھے کہ بارش شروع ہوگئی، انھوں نے بھی اسی ریسٹورنٹ میں پناہ لی۔ جب بارش تھمی تو دوست جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ کیفی کے روکنے کے باوجود وہ نہ رکے۔ کیفی نے اس وقت بے اختیار کہا:۔

ابھی رندوں میں جام چلتا ہے — شیخ اپنا بھی کام چلتا ہے
آپ کے ساتھ آپ کے گھر تک — ٹھہرئیے یہ غلام چلتا ہے

۷۔ کیفی اپنے ایک دوست نواب قادر علی خان سے ملنے کے لئے مکان پر گئے۔ معلوم ہوا کہ پھول چڑھانے کے لئے وہ قبرستان گئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی وہیں پہنچے۔ دیکھا کہ قادر علی خان ایک ایک قبر پر پھول چڑھا رہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر کہنے لگے:۔

کیوں پھر رہے ہو گورِ غریباں پہ نازسے — جو اس سبھا کے دیکھنے والے تھے مر گئے

۸۔ نواب سلطان یار جنگ نائب کوتوال حیدرآباد جنھیں لوگ آغا جانی کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ مدرسہ عالیہ میں زیرِ تعلیم تھے اور فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ اور جب یہ کھیلنے آتے تھے تو کافی لوگ اُن کا کھیل دیکھنے جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ اب کھیل کے موقعہ پر کافی مجمع تھا لیکن آغا جانی کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ جب کوئی بگھی آتی مجمع پکار اٹھتا تھا کہ آغا جانی آ گئے مگر ان کے آنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اسی منتظر مجمع میں کیفی بھی موجود تھے۔ اس انتظار سے مایوس ہو کر کہنے لگے:۔

اتنا اساس ہے اور یہ آنا کانی — آفت ہے قیامت ہے طبیعت آئی
کان اُن کے تصور پہ لگائے رہتے ہیں — آواز بھی آتی ہے تو آغا جانی

۹۔ انھیں خوش گو۔ خوش فکر شاعروں میں میر مہدی علی طباطبائی نواب شہید یار جنگ شہید بقید حیات ہیں۔ اللہ انہیں دیر گاہ سلامت رکھے۔ مگر آج کل ایک عرصہ سے غزل وغیرہ لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مرثیہ۔ نوحہ۔ سلام۔ رباعیات مشغلۂ شعر و سخن ہے۔ مہاراجہ کرشن پرشاد۔ شاد مدار المہام تھے اور ایک روز نواب مہدی نواز جنگ بہادر کے بنگلہ میں ——— جو کشن پرشاد سے متصل تھے، بے تکلف احباب بیٹھے ہوئے حقہ کے کش مار رہے تھے جن میں شہید بھی تھے۔ اچانک مہاراجہ آ گئے۔ سب اسی حال میں اٹھ کھڑے ہو گئے۔ مہاراجہ نے شہید سے فرمایا، شہید کیا ہو رہا ہے، شہید نے عرض کیا حقہ۔ سرکار! مہاراجہ نے کہا اس کی سند میں حقہ پر کچھ شعر سنائیے۔ شہید بامتثال امر کہتے ہیں ؎

طفلی بھی ہے ضعیفی بھی ہے اور شباب بھی — کہنے کو بے زبان ہے حاضر جواب بھی!
غربت کا دوست، عیش کا مونس، شریکِ غم — رہتا ہے ساتھ ساتھ دمِ اضطراب بھی
لب کھولئے جو آپ تو یہ بولنے لگے — پوچھیں نہ آپ تو نہ یہ دے گا جواب بھی
سر میں دھواں، جگر میں تپش دل میں سوز ہے — کھاتا شکل زلف ہے پیچ و تاب بھی
یہ جھونپڑہ میں لطف محل کا دکھاتا ہے — غربت میں دیکھتا ہے امارت کے خواب بھی
بے وجہ تو نہیں ہیں یہ حقہ ستائیاں — کرتے ہیں اس کا شغل یقیناً جناب بھی
قدرت کا کھیل چار عناصر کا کھیل ہے — مٹی بھی ہے ہوا بھی ہے آتش بھی آب بھی
ہم تو یہ نظم کہنے میں مصروف ہو گئے — لپٹے رہا ہے ہو گیا جل کر کباب بھی
آباد ہے شہید میرا کنجِ عافیت — حقہ بھرا ہوا ہے کھلی ہے کتاب بھی

۱۰۔ نواب منظور جنگ ضلع گلبرگہ کے کلکٹر تھے اور نواب شہید یار جنگ مہتمم خزانہ۔ احباب جمع تھے منظور جنگ زنان خانہ سے پان کھاتے ہوئے باہر آئے۔ شہید نے پان مانگا۔ منظور جنگ نے کہا اگر بیٹی پر کچھ شعر کہو تو پان ملیگا۔ شہید نے کہا اگر شعر

آئیں تو بٹوہ میرا ہو جائے گا۔ منظور جنگ نے منظور کر لیا۔ چنانچہ رشید کہتے ہیں:۔

نظر آتی ہے مشتاقو خدا کی شان بٹوے میں   چھپی ہے حق کی اک کان یا ہیں پان بٹوے میں
تمباکو بھی، ڈلی بھی، لونگ بھی، کتھا بھی، چونا بھی   بھری رہتی ہے پنساری کی اک دکان بٹوے میں
عیاں رنگ حسن ہے اور نہاں رنگ حسینی ہے   چھپا رکھا ہے ظالم نے میرا ایمان بٹوے میں
بنا کر ہاتھ سے اُس نے گلوری اپنے رکھی ہے   کسی کا دل ہے بٹوے میں کسی کی جان بٹوے میں
کیا ہے قتل مجھ کو خشک لب پیاسے رشید اُنکے   غضب کی تشنگی ہے اور نہیں ہیں پان بٹوے میں

حاضرین سے کسی نے اعتراض کیا کہ ڈلی وغیرہ کے ساتھ الائچی کا ذکر نہیں ہے۔ رشید نے فوراً جواب دیا کہ آپ پان کا ذائقہ جانیں! جو زردہ کے عادی ہیں وہ الائچی کا استعمال نہیں کرتے۔ سبھوں نے اس کا اعتراف کیا اور منظور جنگ نے بٹوہ دے دیا۔

ادارۂ ادبستان اردو امرتسر کی شاندار پیش کش

ماہ نامہ پگڈنڈی

میر نمبر

کے بہترین مضمون پر ایک سو روپیہ نقد انعام

ادارۂ ادبستان اردو امرتسر نے طے کیا ہے کہ ماہ نامہ پگڈنڈی کا مجوزہ میر نمبر نومبر ۱۹۶۰ء میں شائع کیا جائے اس سلسلے میں ایک اہم فیصلہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ میر نمبر میں شائع ہونے والے ایک بہترین مضمون پر ایک سو روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ اس مقابلہ کی شرکت کے لیے یہ شرائط ہیں

(۱) مضمون یا مقالہ میر تقی میر کی زندگی یا شاعری کے کسی بھی پہلو پر عالمانہ انداز سے لکھا گیا ہو جس میں تحقیقی نقطۂ نظر سے کوئی نئی دریافت ہو یا نئے زاویۂ نظر سے فکر انگیز تنقید کی گئی ہو۔

(۲) مضمون یا مقالہ فل اسکیپ سائز کے کم سے کم ۱۰ صفحات کا ہو اور ۲۵ صفحوں سے کسی حال میں زائد نہ ہو اور کم سے کم دو کاپیاں ہر مضمون کی آنا ضروری ہیں۔

(۳) اس مقابلے میں صرف وہ طلبا شریک ہو سکیں گے جو کسی سرکاری، نیم سرکاری یا منظور شدہ (ریکاگنائزڈ) اسکول یا کالج میں پڑھتے ہوں۔ کم از کم انٹرمیڈیٹ کلاس کا طالب علم ہونا ضروری ہے۔ بی۔اے اور ایم۔اے کے طلبا نیز یونیورسٹی میں اردو کے کسی موضوع پر ریسرچ کرنے والے بھی شرکت کر سکیں گے۔

(۴) مقابلے میں شرکت کے لیے آنے والے مضمون یا مقالے کے ساتھ ایک خط کالج کے پرنسپل یا شعبہ کے صدر (ریسرچ اسکالر ہونے کی صورت میں اس کے گائڈ) کا منسلک ہونا چاہیے جس میں مہر و دستخط کے ساتھ یہ لکھا گیا ہو کہ امیدوار کالج / یونیورسٹی کا بونا فائڈ طالب علم ہے۔

(۵) مضامین / مقالے مقابلے میں شرکت کے لیے رجسٹری سے بھیجے جائیں اس کے ساتھ اتنی ہی قیمت کے ٹکٹ بھی ہوں، مقابلے میں شریک نہ ہو سکنے یا نامنظور ہونے کی صورت میں اسے رجسٹری ہی سے واپس کیا جا سکے۔

(۶) مقالے کے ساتھ ادارۂ ادبستان اردو کا مطبوعہ فارم (جو صفحہ مقابل پر چھاپا گیا ہے) امیدوار اپنے قلم سے بھر کر منسلک کرے گا مقالے میں کسی جگہ مضمون نگار کا نام یا کوئی منفرد نشان نہ ہو نام وغیرہ الگ چٹ پر لکھ کر مضمون کے ساتھ منسلک کیا جائے۔

(۷) مضامین / مقالات کے دفتر میں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۰ء ہے۔ اس تاریخ کے بعد آنے والے مضامین / مقالے مقابلے میں قبول نہ کیے جا سکیں گے۔

(۸) بہترین مضمون / مقالے کا فیصلہ کرنے کے لیے اردو کے پانچ مشہور عالموں، ناقدوں اور محققوں سے رائے طلب کی جائے گی۔ ان حضرات کا تعین ادارہ پگڈنڈی خود کرے گا اور اس سلسلے میں ان کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔ انتظامی امور کی سہولت کے لیے مندرجہ بالا شرائط پر اضافہ کرنے یا ان میں ترمیم کرنے کا اختیار ادارے کو حاصل رہے گا۔

(۹) اس مقابلے میں شرکت کی کوئی فیس نہیں ہے۔

مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے ذیل کے پتے پر خط و کتابت کی جا سکتی ہے۔ جوابی خط بھیجنا ضروری ہے۔

ادارۂ ادبستان اردو۔ ہال بازار۔ امرتسر

میرنمبر کا ادبی انعامی مقابلہ
فارم داخلہ

(کوئی لفظ کٹا پھٹا یا مبہم اور مغشوش نہ ہونا چاہیئے)

بخدمت مدیر محترم ماہ نامہ پگڈنڈی
ادارۂ ادبستان اردو ۔ ہال بازار
امرتسر

مکرمی ۔ میں 'میرنمبر' کے لیے ہونے والے ادبی مقابلے میں شرکت کے لیے اپنا مضمون بہ عنوان ——— ارسال کر رہا ہوں جو ——— کے ——— صفحات کو محیط ہے اور اس میں اندازاً ——— الفاظ ہیں ۔
میں نے اس مقابلے کی تمام شرائط اچھی طرح پڑھ لی ہیں اور ان کو منظور کرتا ہوں ۔ مجھے آپ کے ادارے کا ہر فیصلہ قبول ہوگا ۔
میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ مضمون میرا طبع زاد ہے اور میرے علم و اطلاع کی حد تک اس میں سرقے یا توارد کا احتمال نہیں ہے ۔

———
امیدوار کے پورے دستخط

یہ سب خانے انگریزی کے بڑے حرفوں میں پُر کیے جائیں

نام امیدوار ——— عمر ———
والد کا نام ———
مستقل پتا ———
یونی ورسٹی یا کالج ———
کس درجے کا طالب علم ہے ———
تاریخ ارسال مضمون ———

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا فارم میں نے خود اپنے قلم سے پُر کیا ہے اس میں کوئی لفظ مغشوش یا کٹا پھٹا نہیں ہے اس میں فراہم کی ہوئی اطلاعات میرے علم و یقین کی حد تک درست ہیں

———
امیدوار کے دستخط

صفدر آہ

انسان رباعیات

بگڑا ہوا انسان ہے سنورنے والا تہذیب کا حسن ہے نکھرنے والا
اس آج کی پستی سے نہ بددل ہونا اِک کوہِ عروج ہے ابھرنے والا

یہ سیلِ زمانہ کا تلاطم توبہ! یہ لیل و نہار کا تصادم توبہ!
اس محشرِ زندگی کے ہنگاموں میں انساں! ترے لب پہ تبسم؟ توبہ!

فطرت نے کہا کہ کیوں ہے ابنِ آدم گھبرا گیا زلفیں جو ذرا کیں برہم
ہوتا ہے یہی سنگار کرنے سے قبل لے دیکھ کہ بن سنور کے آپہنچے ہم

طاعت کی خوئے زشت تاراج ہوئی انسان کے سر کا سرکشی تاج ہوئی
جس روز ہوا ہبوطِ آدم بہ زمیں پہلی بشریت کی وہ معراج ہوئی

اس دہر کا کج کلاہ ہونا ہے تجھے شاہنشہِ مہر و ماہ ہونا ہے تجھے
انساں! وطنیت کی ضلالت سے نکل کونین کا بادشاہ ہونا ہے تجھے

غمازیاں کوستی ہیں چپ رہنے کو جیحوں ہیں قطروں سے ابھی بہنے کو
بالغ نہیں انساں کا تعقل ورنہ ہر ذرہ لب کشا ہے کچھ کہنے کو

حافظ امرتسری

قطعات

ایک ہم ہیں کہ داد کی تصویر　　ایک تم ہو کہ چاند جیسے ہو
میل ہا میل کا تفاوت ہے　　اب کوئی بات ہو تو کیسے ہو

چاند موجود ہو ستارے بھی　　تب کہیں جا کے رات بنتی ہے
میری تنہائیوں کے ساتھ اگر　　آپ بھی ہوں تو بات بنتی ہے

تُو نے آنکھوں سے مے پلا کے ہمیں　　میکدے کا غرور توڑا ہے
تیری آنکھوں نے کیا خبر ساقی　　کتنے غنچوں کا خوں نچوڑا ہے

زہر ہے یا شراب ہے اس میں　　میرے ہاتھوں میں جام ہے تو سہی
کیف و مستی ملے ملے نہ ملے!　　بادہ خواروں میں نام ہے تو سہی

زلف رُخ سے وہ جب ہٹاتے ہیں　　روشنی کی نمود ہوتی ہے
ان کو تشبیہ روشنی سے نہ دے　　روشنی بے وجود ہوتی ہے

بے حسی دیکھ کر زمانے کی　　میرے سینے کے داغ جلتے ہیں
اَن گنت گھر ہیں روشنی سے تہی　　مرقدوں پر چراغ جلتے ہیں

کون دیوانگی کو اپنائے　　عاشقی نے مزاج بدلا ہے!
دورِ فرہاد میں جو رائج تھا　　اب وہ کہنہ رواج بدلا ہے

جگر بریلوی

غزل

تمھاری راہ میں جس کو بھی چلتے دیکھا تھا
قدم قدم پہ اُسے ہاتھ ملتے دیکھا تھا

ہوا تھا اشکِ محبت سے جو چمن سیراب
اُسی کو پھولتے دیکھا تھا پھلتے دیکھا تھا

یہ مت کہو کہ کسی کا کوئی نہیں، ہم نے
چراغ گورِ غریباں پہ جلتے دیکھا تھا

نقاب اُٹھتے ہی دل پر نہ جانے کیا گزری
بس ایک شعلہ دہن سے نکلتے دیکھا تھا

بہار چھائی ہوئی تھی برس رہا تھا نور
اُسی زمیں پہ جہاں دل کو جلتے دیکھا تھا

مریضِ ہجر پہ بھاری تھی ایسی شب کہ اُسے
ہر ایک سانس پہ کروٹ بدلتے دیکھا تھا

اُسی گلی میں جگر چل کے جان دیجے
جہاں سے دل کا جنازہ نکلتے دیکھا تھا

عبدالمجید حیرت شملوی

غزل

دل کیسے سنبھالے کوئی دل کیسے سنبھالے
اللہ کسی پہ بھی بُرا وقت نہ ڈالے

تھا اور تو کیا دل میں بجز داغِ تمنا
وہ بھی نہ مگر دیکھ سکے دیکھنے والے

بیمار کرے بھی تو کرے کس پہ بھروسا
ہیں چارہ گروں کے بھی تو انداز نرالے

کیا دیکھئے ہو حشر کہ اُمید کی کشتی
مدت سے ہے گردابِ حوادث کے حوالے

ہجراں کا کسی طور مداوا نہیں ہوتا
دل میں تپشِ غم سے جو پڑ جاتے ہیں چھالے

بس دیکھ لیا اُن کی عنایت کا نتیجہ
اس سے تو کوئی غیر کا احسان اُٹھالے

افسردہ و آزردہ ہو دل جس سے کسی کا
ایسی بھی زباں سے کوئی کیوں بات نکالے

اس دردِ بلا خیز کے آلام نہ پوچھو
مُرجھائے ہیں کیا کیا شجرِ اُمید کے پالے

کچھ اور اگر صورتِ حالات نہیں ہے
اس دل پہ کہیں یاس ہی قبضہ نہ جما لے

کوشش تو یہی ہے کہ کبھی زاہدِ ناداں
رندوں کی بھی آواز میں آواز ملا لے

ہے سب کو یہی فکر کہ تعمیر نئی ہو
ہے کون جو گرتی ہوئی دیوار سنبھالے

غم یہ ہے کہ حیرتؔ کو بھی تسکین نہیں ہوتی
جب تک کہ غزل کہہ کے کسی کو نہ سنا لے

غزل

اپنی خوئے وفا کو کیا کہیے   اُن کے ذوقِ جفا کو کیا کہیے

بے قصوری کو اپنی کیا کہیے   اِس نظامِ سزا کو کیا کہیے

بن گیا اُن کی سُرخیٔ عارض   خونِ عہدِ وفا کو کیا کہیے

راہزن کو بھی آ رہا ہے حجاب   عشوۂ رہنما کو کیا کہیے

شاخِ گُل سے لپٹ کے روتی ہے   اس چمن کی ہوا کو کیا کہیے

ہم چراغاں تو خیر کر لیں، مگر   تیرگیٔ فضا کو کیا کہیے

غیر تو خیر غیر ہیں، لیکن   ہائے اس آشنا کو کیا کہیے

شوق کو بھی جھجک سی ہوتی ہے   جلوۂ خود نما کو کیا کہیے

اپنی رفتار بڑھتی جاتی ہے   منزلِ تیز پا کو کیا کہیے

نشترِ کوہنِ برق ساماں کو   نغمۂ شعلہ زا کو کیا کہیے

منزلیں پاؤں چومتی ہیں امام!

اپنے شوقِ رسا کو کیا کہیے

محسن زیدی

دل تاریک ہو دھواں جیسے
رجنوں ماہ و کہکشاں جیسے

شہرِ دل ہے کہ اک خرابہ ہے
تھا نہ کوئی یہاں نشاں جیسے

دل سے یوں اُنکی یاد گزری ہے
نکہتِ گل کا کارواں جیسے

اُف یہ رنگینیاں زمانے کی
کچھ بہاریں ہیں بے خزاں جیسے

راز کیا کیا ہیں اُن نگاہوں میں!
کچھ عیاں ہیں تو کچھ نہاں جیسے

ہو چکے ختم سب ستم گویا!
اب زمانہ ہے مہرباں جیسے

زندگی سی کچھ ان دنوں اے دوست
زندگی ہے کشاں کشاں جیسے

دل کا اب کچھ یہ حال ہے محسن!
غم کی چلتی ہوں آندھیاں جیسے

سعید اختر نعمانی

فکر کیا جو رہِ دُشوار ابھی باقی ہے
عشق سا قافلہ سالار ابھی باقی ہے

آپ سے اور کسی وعدہ کی اُمید تو کیا
آپ کا وعدۂ دیدار ابھی باقی ہے

مجھ سے مایوس نہوں شہرِ نگاراں کے مکیں
عشق زندہ ہے ابھی پیار ابھی باقی ہے

غمِ دوراں تجھے اپنا نہ سکوں گا میں ابھی
دل میں کچھ عکسِ غمِ یار ابھی باقی ہے

قصۂ دل ہی پہ رو ئیں نہ ابھی اہلِ جنوں
داستانِ رسن و دار ابھی باقی ہے

کوئی چھیڑے نہ ابھی چاک گریبانوں کو!
شہرۂ طرۂ دستار ابھی باقی ہے

پاسِ جمہوریت اے ساقیٔ میخانہ ذرا
دیکھ لے کون سا میخوار ابھی باقی ہے

آرمان لسوئوی

چمن میں برگ سے گُل سے کلی سے
پتہ پُوچھا تمہارا ہر کسی سے

خوشی کی کیا توقع زندگی سے
ملی ہے روشنی بھی تیرگی سے

اگر ہے زندگی کو ضد خوشی سے
تو باز آئے ہم ایسی زندگی سے

سہارا تم ذرا دینا نظر کا
اُٹھاؤں گا میں بارِ غم خوشی سے

غمِ دُنیا کو تھا درکار مرکز
جگہ دیدی مرے دل نے خوشی سے

سفینے کے نگہباں وقتِ مشکل
تماشا دیکھتے ہیں دُور ہی سے

زمانے نے کئی مطلب لئے ہیں،
مرے نالوں سے میری خامشی سے

تجھے ارماں یہ سوزِ غم مبارک!
جہاں روشن کیا دل کی لگی سے

حامد بھکاوی

نازشِ روزگار ہوتا ہے
عشق بھی باوقار ہوتا ہے

ہر نفس دل پہ بار ہوتا ہے
جب غمِ انتظار ہوتا ہے

کوششِ ضبطِ غم سے حالِ دل
اور بھی آشکار ہوتا ہے

عشق کا لمحۂ نشاط انگیز
غم کا پروردگار ہوتا ہے

نگہِ ناز کا ہمارے بعد
کون امیدوار ہوتا ہے

زمزمۂ ذکرِ گیسو و رُخ سے
سازِ دل نغمہ بار ہوتا ہے

بات اتنی طویل ہوتی ہے
جس قدر اختصار ہوتا ہے

غم ترا حاصلِ حیات سہی
پھر بھی اب ناگوار ہوتا ہے

اب تو دل محفلِ نگاراں میں
اِک غریب الدیار ہوتا ہے

پُرسشِ حالِ زار سے حامد
مُفت دل زیرِ بار ہوتا ہے

حامد الہ آبادی

کبھی زخموں پہ ہنستے ہیں کبھی گرتے سنبھلتے ہیں
کوئی تو بات ہے ایسی کہ ہم لہرا کے چلتے ہیں!

یہاں تک طول کھینچا ہے ہماری خوش نگاہی نے
کہ ہر ہر سانس پر سو سو طرح کروٹ بدلتے ہیں

کوئی ناگفتنی لب تک یقیناً آ گئی ہوگی
زباں بیباک ہو تو دوست دشمن سب ہی جلتے ہیں

یہ مجبوری یہ مختاری عجب نیرنگ فطرت ہے
لبوں پر تشنگی اور آنکھ سے چشمے اُبلتے ہیں

سکوت دل نے چھیڑا تھا کبھی سازِ وفاداری
زبانِ بے خودی پر آج بھی نغمے مچلتے ہیں!

چراغ آرزو کی لو غمِ ہستی سے بڑھ کر ہے
شبِ تاریک میں ہم شمع روشن لے کے چلتے ہیں

نہیں ہر ایک کے بس میں ہوا کا رُخ بدل دینا
یہ اُن کا کام ہے جو گود میں موجوں کی پلتے ہیں

نویدِ صبح عشرت کون لائے گا زمانے میں!
یہ سب باتیں ہیں اُنکی جن دلوں میں خواب پلتے ہیں

نگاہیں ملتے ہی نظریں جھکا کر مسکرا دینا!
ذرا سی بات ہے لیکن کئی پہلو نکلتے ہیں

عجب موسم ہے حامد موسم ابر بہاراں بھی
فضائیں رشک جنت ہیں مگر ہم ہیں کہ جلتے ہیں

حکیم انجم اعظمی

غم سے خوشی کا کام لیا ہے کبھی کبھی
یوں ان سے انتقام لیا ہے کبھی کبھی

اس احتیاط سے کہ زمانہ نہ سُن سکے
چپکے سے تیرا نام لیا ہے کبھی کبھی!

خاموش رہ کے ہم نے کسی کی نگاہ کا
آنکھوں سے بھی پیام لیا ہے کبھی کبھی

یُوں بھی کرم ہوئے ہیں تری التفات کے
ہم نے جگر کو تھام لیا ہے کبھی کبھی

کیسے کہوں غلط ہے، فسانہ ہے جذبِ دل
اس نے بھی میرا نام لیا ہے کبھی کبھی!

بھولی ہوئی جنوں کی خلش یاد آ گئی
کانٹوں کا جب پیام لیا ہے کبھی کبھی

سازِ نگاہ شوق سے نغمے برس پڑے
جب دل نے تیرا نام لیا ہے کبھی کبھی!

اِک مختصر سے لمحۂ عشرت کے شوق میں
لطفِ غمِ دوام لیا ہے کبھی کبھی!

انجم نے بزمِ کیف میں ساقی کے ہاتھ سے
زہرابِ غم کا جام لیا ہے کبھی کبھی

ادیب سہیل

حسن کے بام پہ اُبھریگا جو خورشید اب کے
ہوگی حاصل اُسے ہر ذرہ کی تائید اب کے

ذرۂ خاک کو اس طرح کریں گے تاباں!
رشک فرمائیں گی خود زہرہ و ناہید اب کے

ایک لحظہ میں یونہی ختم ہوئی آمد و شد
جیسے غم خانے میں آئی ہی نہ تھی عید اب کے

ہوگی دلداریٔ ساحل سے تمنا محفوظ
پائے گی دادِ سفر کشتیٔ اُمید اب کے

چلمن و بام کی ویرانی میں آئے گی بہار
ہوگی نظروں کو میسر طربِ دید اب کے

ناز اُس جرأتِ کردار پہ کیجیے جس نے
کھیل کر جان پہ کی عشق کی تجدید اب کے

قربتِ کاکل و رخسار ہے اُس کا انجام
داستاں جس کی ہوئی دار سے تمہید اب کے!

ساتھ ہو جوشِ جنوں کے رہِ ہستی میں خرد
دوستو پیشِ نظر رکھیں یہ تاکید اب کے

اب ہوا لوگوں کو احساس مگر ہم نے سہیل
روزِ اوّل ہی سے کی صبح کی تردید اب کے

نیاز بدایونی

رات رُت کس قدر رنگیلی تھی
مَیں نے صرف ایک گھونٹ پی لی تھی

قصر پر بھی اُٹھا تو تھا تیشہ
اس میں اک خوابگہ سجیلی تھی

ہم تری دُھن میں جان کھو دیتے
وقت کی آنکھ لال پیلی تھی

آگئی نیند غم کے ماروں کو
اس گلی کی ہوا نشیلی تھی

لالہ رُخ لوگ رُوٹھ ہی تو گئے
موسمِ گل میں جیب سی لی تھی

میری آنکھیں ہی کیا دمِ رخصت
آپ کی آستیں بھی گیلی تھی

ذکرِ خوبانِ شہرِ نو سے نیاز!
آپ کی ہر غزل رسیلی تھی

ایڈگر ایلن پو

شکست کی آواز

عصبی المزاج ——— ہاں، ہاں! میں بے حد عصبی المزاج رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ لیکن آپ مجھے پاگل کیوں کہنے لگے۔ اس بیماری نے میری حسیات کو کمزور نہیں بنایا، انھیں تباہ نہیں کیا، بلکہ انھیں تیز کر دیا ہے اور میری سننے کی قوت تو بے حد تیز ہو گئی ہے۔ میں نے آسمان کو اور پاتال کو سنا ہے۔ میں نے بہت سی باتیں جہنم کی بھی سنی ہیں۔ پھر میں کیونکر پاگل پاگل ہو سکتا ہوں۔ ذرا ملاحظہ ہو، میں کتنی صحت سے اور کتنے سکون کے ساتھ یہ کہانی کہہ رہا ہوں۔

پہلے پہل میرے ذہن میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا؟ اس کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک بار پیدا ہو چکنے کے بعد یہ دن رات میرے ذہن پر مسلط رہنے لگا۔ مقصد کوئی نہیں تھا۔ کوئی غصہ نہیں تھا مجھے اس معمر آدمی سے پیار تھا۔ اس نے مجھے کبھی فریب نہیں دیا۔ کبھی میری توہین نہیں کی۔ کیونکہ اس کا سونا، کبھی بھی میری خواہش نہیں رہا۔ میرا خیال ہے، یہ سب آنکھ کے سبب سے ہے۔ ہاں! یہی بات ہے۔ اس کی آنکھ ایک حریص اور موذی کی آنکھ تھی۔ پیلی پیلی، نیلی آنکھ ——— اس پر جھلی سی چڑھی ہوئی تھی۔ جب کبھی وہ آنکھ مجھ پر پڑتی میرا خون سرد ہو جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ ——— دھیرے دھیرے میں نے معمر آدمی کی جان لینے اور اس طرح اس آنکھ سے خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات دلانے کا فیصلہ کیا۔

بس اتنی سی بات ہے اور آپ مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں۔ دیوانوں کو کسی بات کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کو دیکھ لینا چاہئے تھا۔ آپ کو جان لینا چاہئے تھا کہ میں نے اپنا کام کتنی عقلمندی، کتنی احتیاط اور کتنی دور اندیشی سے کام لیتے لیتے ہوئے انجام دیا ہے میں نے کتنی مکاری سے کام لیا ہے۔ اس کو ہلاک کرنے سے پہلے ——— ایک ہفتے کے عرصے میں، میں اس کے ساتھ بڑی مروت اور محبت سے پیش آتا رہا تھا۔ اس سے پیشتر میں نے کبھی بھی اس کے ساتھ اتنی محبت اور مروت نہ برتی تھی۔ ہر رات، کوئی آدھی رات گئے، میں اس کے دروازے کے پٹ کو گھماتا اور کھول دیتا۔ یہ کام میں بڑی آہستگی سے کرتا تھا اور جب دروازہ ذرا سا کھل جاتا تو میں لالٹین کو اندر کر دیتا۔ یہ لالٹین ہر پہلو سے ڈھکی ہوئی ہوتی تھی۔ یہ اس لئے کہ روشنی کی ایک بھی کرن اس سے نہ نکل سکے۔ پھر میں دھیرے سے اپنا سر اندر لے جاتا۔ میں اپنے سر کو کسی طرح کمرے کے اندر لے جاتا تھا۔ اگر آپ دیکھ لیتے۔ تو یقیناً ہنس دیتے۔

معمر آدمی کی نیند خراب نہ ہو، میں آہستہ، بہت ہی آہستہ اپنے سر کو اندر لے جاتا تھا۔ اس دروازے کے کھلے ہوئے پٹ سے کمرے کے اس سر کو پورا اندر لے جاتے ہوئے مجھ کو ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ اور جب یہ سوچتا تو میں اس کو، اس کے بستر پہ سوئے ہوئے دیکھتا۔ ہائے کیا کوئی پاگل اتنا سیانا ہو سکتا ہے؟ اور جب میرا سر کمرے میں آ چکتا تو میں لالٹین کی روشنی کو آہستگی کے ساتھ (کیونکہ چولیں چرچراتی تھیں) تیز کر دیتا۔ بس صرف اتنا کہ روشنی کی ایک باریک کرن، صرف ایک کرن اس حریص آنکھ پر پڑتی۔ یہ کام میں سات راتیں کرتا رہا۔ ہر رات آدھی رات گئے۔ ہر رات وہ حریص آنکھ میں نے بند پائی۔ سو کام تکمیل ناممکن تھی۔ میں اس معمر آدمی سے تنگ نہیں اس کی "حریص آنکھ" سے پریشان تھا اور ہر صبح جب سورج طلوع ہوتا

تو مَیں بڑی جرأت کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوتا۔ بڑی دل جمعی سے گفتگو کرتا۔ بڑے پُرخلوص انداز سے اس کا نام پکارتا اور اس سے پوچھتا کہ رات کیسے گزری؟ مجھ پر یہ شک کرنے کے لئے کہ میں ہر رات، ٹھیک بارہ بجے، اسے اندر سویا ہُوا دیکھتا ہوں۔ اس کا جیّد اور متبحّر ہونا ضروری تھا۔

آٹھویں رات دروازہ کھولنے میں مَیں نے معمولی سے زیادہ احتیاط برتی تھی۔ مَیں بہت دھیرے دھیرے ہاتھ کو بڑھا رہا تھا، اتنا دھیرے کہ گھڑی کی منٹوں والی سُوئی بھی حرکت میں اس سے تیز ہوتی ہوگی۔ اس رات سے پیشتر مجھے کبھی اپنی قوتوں کو، اپنی دانشمندی کا اس شدّت سے احساس نہ ہُوا تھا۔ اس وقت مَیں اپنی کامیابی کی خوشی کو بمشکل چھُپا پایا تھا۔ اس خیال پر کہ ادھر میں دھیرے دھیرے بہت ہی دھیرے دروازے کو کھول رہا ہوں اور ادھر وہ ہے کہ میرے پوشیدہ جذبات اور ارادے کا خواب تک نہیں دیکھ سکتا۔ میں دبی ہنسی ہنس دیا تھا۔ شاید اس نے میری ہنسی سُن لی تھی۔ اس وقت اچانک اس کے بستر پر حرکت ہوئی تھی۔ مانو وہ چوکنّا ہو گیا ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے، اس پر مَیں پیچھے ہٹ گیا ہوں گا ــــ نہیں، مَیں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے گھُپ اندھیرے کمرے میں غار جیسی تاریکی چھائی ہوئی تھی (چوروں کے ڈر سے کھڑکیوں کے پٹ بڑی مضبوطی کے ساتھ بند کئے ہوئے تھے)۔ مَیں جانتا تھا کہ اتنی گہری تاریکی میں وہ دروازے کے کھُلے ہوئے پٹ کو نہیں دیکھ سکے گا۔ سو مَیں پہلے کی طرح دھیرے، بہت ہی دھیرے دروازے کے پٹ کو کھولتا رہا)

اب میرا سر کمرے کے اندر تھا۔ مَیں لالٹین کی روشنی تیز کرنے کو تھا کہ میرا انگوٹھا لالٹین کی درز پر سے پھسل گیا۔ وہ معمر یکلخت بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ وہ چلّایا۔ کون ہے؟ مَیں بے حِس و حرکت کھڑا رہا۔ مَیں کوئی حرف زبان پر نہ لایا۔ کوئی گھنٹے بھر تک مَیں نے اپنے کسی پٹھے کو بھی جنبش نہ دی اور نہ ہی اس عرصے میں، مَیں نے اس کے بستر پر دراز ہونے کی آواز سنی۔ وہ ابھی تک بستر پر بیٹھا ہُوا تھا اور گوش برآواز تھا۔ بالکل ایسے، جیسے مَیں ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری رات اور اس طرح آج کی رات تک گوش برآواز رہا تھا۔

پھر مجھے ایک ہلکی سی کراہ سنائی پڑی۔ مَیں جانتا ہوں یہ موت کے ڈر سے تھی۔ یہ کراہ کسی تکلیف یا غم کے سبب سے پیدا نہ ہوئی تھی۔ نہیں، قطعی نہیں۔ جب رُوح شدید خوف میں مبتلا ہوتی ہے تو ہلکی سی یہ آواز خوف اس وقت رُوح کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہوئی سُنائی دیتی ہے۔ مَیں اس آواز سے بخوبی مانوس ہوں۔ اکثر راتوں کو، آدھی رات گئے مَیں نے ــــ اپنے ہی سینے سے آواز یہ اُٹھتی، اور بھیانک گونج کے ساتھ تیز ہوتی ہوئی محسوس کی ہے۔ خوف زدہ کر دینے والی اس آواز نے اکثر میرا ذہن پراگندہ کر دیا ہے۔ مَیں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مَیں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ اس وقت اس معمر آدمی کی محسوسات کیا تھیں۔ میرا دل گو ہنس رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس پر بڑا ہی ترس آ رہا تھا۔ دراصل آواز نے جب سے اُسے بیدار کیا، اس وقت سے وہ بدستور جاگ رہا تھا۔ اس کے خدشات ہر لحظہ بڑھ رہے تھے اور وہ انہیں بے بنیاد قرار دینے کی فکر میں تھا لیکن بے سود ــــ وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ــــ "کچھ بھی تو نہیں ہے۔ چمنی سے ہوا گزری ہوگی۔ کوئی چوہیا فرش پر بھاگتی ہوئی گزر گئی ہوگی" ــــ یا پھر، ممکن ہے کوئی جھینگر ہی بول کر رہ گیا ہو ــــ ہاں ــــ وہ انہی خیالوں سے اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش میں تھا لیکن اس کی ایک کوشش بھی کام نہ آ رہی تھی۔ اس کی ایک کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی تھی کیونکہ موت جو اس کے تعاقب میں تھی اپنی سیاہ پرچھائیں کے ساتھ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے شکار کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ حالانکہ اس نے نہ تو کچھ دیکھا اور نہ سُنا ہی لیکن یہ ایک غیر محسوس سائے کا اندوہگین اثر ہی تھا جس کے سبب سے وہ میرے سر کو کمرے کے اندر محسوس کر رہا تھا۔

میں بڑے صبر کے ساتھ، بڑی دیر تک کھڑا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر اس کے بستر پر دراز ہونے کی آواز سُنے بغیر،
ں نے لالٹین کی درز کو تھوڑا سا کھولا۔ میں نے لالٹین میں یہ درز کتنی آہستگی کے ساتھ بنائی تھی —— آہستہ —— آہستہ
ہاں تک کہ ایک مدھم مکڑی کے تار جیسی باریک کرن اس سے پھوٹ نکلی تھی۔ وہ کرن اس کی مریض اور موذی آنکھ پر پڑ رہی تھی
وہ کھلی ہوئی تھی۔ نکلی پڑ رہی تھی۔ جیسے جیسے میں اُسے دیکھ رہا تھا آپے سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میں اُسے نہایت
واضح طور سے دیکھ رہا تھا وہ دھندلی نیلی تھی اور اس پر ایک بھیانک پردہ سا پڑا ہوا تھا۔ میری نظر اس پر کیا پڑی کہ میری
رگوں میں خون منجمد ہوا جا رہا تھا۔ اس معمر آدمی کا چہرہ یا چہرہ یا جسم کا کوئی اور حصہ مجھے دکھائی نہیں پڑ رہا تھا کیونکہ روشنی کی
کرن جیسا کہ میں نے چاہا تھا ٹھیک اس کے جسم کے منحوس حصے، اس کی موذی آنکھ پر پڑ رہی تھی۔

کیا میں نے آپ کو بتا نہیں رکھا کہ میری حسیات ضرورت سے زیادہ تیز نہیں۔ انہیں کے سبب تو آپ مجھے پاگل سمجھنے
کی غلطی کر بیٹھے ہیں —— میں آپ کو بتاتا ہوں —— پھر ایک ہلکی لیکن تیز سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ آواز روئی
میں ملفوف گھڑی کی آواز جیسی تھی —— یہ آواز کیا تھی —— کس کی تھی؟ میں یہ بھی جانتا ہوں —— یہ معمر آدمی کے دل کے
دھڑکنے کی آواز تھی۔ جس طرح ڈھول کی آواز سن کر سپاہی کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اسی طرح اس کے دل کے دھڑکنے کی
آواز سے میرا غیظ بھی بڑھ گیا تھا۔

اس پر بھی میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور وہیں بغیر کسی حرکت کے کھڑا رہا۔ میں بہ وقت سانس لے رہا تھا۔
لالٹین میرے ہاتھ میں تھی —— بالکل جامد سی —— میں کتنی دیر تک لالٹین سے پھوٹنے والی کرن کو اس کی آنکھ
پر ڈال سکتا ہوں؟ میں نے اپنے آپ کو اسی آزمائش میں ڈال دیا۔ اسی اثنا میں دل کی دھپ دھپ بڑھ گئی۔ ہر لحظہ یہ
تیز اور بلند ہوتی جا رہی تھی۔ معمر آدمی کا خوف یقیناً اس وقت انتہا پر ہوگا۔ دھپ دھپ بلند ہو رہی تھی۔ میں آپکو ٹھیک
بتا رہا ہوں۔ یہ آواز ہر لمحہ بلند ہو رہی تھی

آپ جانتے ہی ہوں گے اور یہ تو میں نے آپکو بتا ہی رکھا ہے کہ میں عصبی المزاج ہوں —— عصبی المزاج تو میں
ہوں ہی —— آدھی رات کے وقت، جبکہ اس قدیم گھر پر ایک گہری خاموشی مسلط تھی، اس عجیب آواز نے مجھے مشتعل کر کے
مجھ پر خوف طاری کر دیا —— ایسا خوف جسے میں کسی طرح بھی پرے نہ جھٹک سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے اپنے آپ کو تھامے
میں رکھا اور اپنی جگہ سے ذرہ برابر بھی نہ ہلا۔ لیکن دھڑکن تھی کہ ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرا دل پھٹ
جائے گا۔ پھر ایک اور فکر نے مجھے آ لیا —— یہ آواز پڑوسی سن لے گا۔ معمر آدمی کا وقت آ پہنچا تھا۔ ایک چیخ کے ساتھ
میں نے لالٹین پوری کھول دی اور کمرے کے اندر گھس گیا۔ اس نے چیخ ماری۔ ایک —— بس صرف ایک —— دوسرے
ہی لمحے میں، میں نے اُسے گھسیٹ کر فرش پر گرا لیا اور اس کا بھاری بستر اس کے اوپر کھینچ لیا۔ جو کام ہو گیا تھا اسے
دیکھتے ہوئے میں مسکرا دیا۔ گو دل کی دھڑکن تھوڑی دیر بعد تک بھی سنائی دیتی رہی تھی۔ لیکن میں اس سے قطعی پریشان
نہ ہوا تھا کیونکہ یہ دیوار کے دوسری طرف نہ سنی جا سکتی تھی —— پھر —— یہ دھڑکن بھی بند ہو گئی۔ معمر آدمی مر چکا تھا
میں نے اس کے اوپر سے بستر کو ہٹایا اور لاش کا جائزہ لیا۔ ہاں وہ پتھر —— پتھر کی طرح بے جان ہو چکا تھا۔ میں نے
اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند لمحوں تک میں اس کے دل پر ہاتھ رکھے رہا۔ زندگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ پتھر کی طرح بے جان ہو
چکا تھا۔ اب اس کی آنکھ مجھے کبھی پریشان نہ کر پائے گی۔

کیا اب بھی آپ مجھے پاگل سمجھتے ہیں؟ لیکن جب میں آپ کو اس احتیاط کے بارے میں بتاؤں گا جو میں نے لاش کو چھپانے میں

بدلی تھی۔ تو یقیناً آپ مجھے پاگل سمجھنا بند کر دیں گے۔ رات گھٹتی جا رہی تھی۔ میں نے تیزی مگر خاموشی کے ساتھ کام شروع کیا۔ سب سے پہلے میں نے اس لاش کے ٹکڑے کئے۔ میں نے اس کا سر، بازو اور ٹانگیں الگ کر دیں۔

پھر میں نے کمرے کے فرش میں لگے ہوئے تختوں میں سے تین تختے اکھاڑے اور لاش کو وہاں رکھ دیا۔ پھر میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان تختوں کو وہاں دوبارہ جما دیا۔ یہ کام میں نے اتنی صفائی کے ساتھ کیا کہ کوئی انسان حتیٰ کہ آسمانی آنکھ بھی اس کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ کوئی شے دھونے والی نہ تھی۔ کوئی دھبّہ، خون کا ایک بھی دھبّہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس معاملے میں میں نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ دراصل وہ سب ایک ٹب میں سما گیا تھا۔ ہا ۔ ہا!

جب میں نے یہ کام ختم کیا تو چار بج رہے تھے لیکن رات ابھی بڑی گہری تھی۔ جیسے ہی چار کا گھنٹہ بجا۔ باہر گلی والے دروازے پر دستک سنائی پڑی۔ میں بڑے اطمینان کے ساتھ دروازہ کھولنے کے لئے نیچے اترا ——— اب میرے لئے ڈرنے کی بات بھی کیا تھی؟ میں نے دروازہ کھولا۔ تین آدمی وارد ہوئے۔ انھوں نے بڑی خوش خلقی کے ساتھ اپنے آپ کو متعارف کرایا۔ وہ پولیس افسر تھے۔ رات کو ایک چیخ سُنی گئی تھی۔ پڑوسی کو کسی گڑبڑ کا گمان گزرا تھا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ سو وہ (پولیس افسر) مکان کی تلاش کے لئے آئے تھے۔

میں مسکرا دیا ——— اب میرے لئے ڈرنے کی بات بھی کیا تھی۔ میں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ میں بولا۔ میں خواب میں چیخ اٹھا تھا۔ چیخ میری ہی تھی۔ معمر آدمی تو ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ میں پولیس افسروں کو لئے لئے سارا مکان گھوم آیا۔ جب وہ اچھی طرح دیکھ بھال چکے تو بالآخر انھیں اس کے کمرے میں لے آیا۔ میں نے اس کا مال خزانہ انھیں دکھایا جو محفوظ تھا اور جسے کسی نے چھوا تک نہ تھا۔ اپنے اعتماد کے خروش میں، میں کرسیاں اٹھا لایا اور لا کر کمرے میں رکھ دیں۔ میں نے انھیں اسی کمرے میں دراز ہو بیٹھنے اور اپنی تھکن دور کرنے کے لئے کہا اور بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے میں نے اپنی کرسی وہیں ڈال دی، جہاں وہ معمر آدمی دوامی آرام کی نیند سو رہا تھا۔

پولیس افسر مطمئن ہو گئے تھے۔ میرے انداز اور رویئے سے ان کی تسلی ہو گئی تھی۔ میں بھی غیر معمولی طور سے مطمئن تھا۔ وہ بیٹھے گفتگو کرتے رہے اور میں خوش خوش ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ وہ جانی پہچانی چیزوں کی باتیں کر رہے تھے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرا رنگ پیلا پڑنے لگا ہے۔ میں نے چاہا کہ اب وہ چلے جائیں۔ میرا سر دکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے کانوں میں کوئی چیز بجتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی لیکن وہ بدستور بیٹھے باتیں کئے جا رہے تھے۔ آواز اور واضح ہو گئی۔ کوئی چیز تھی کہ بج رہی تھی۔ آواز اور بھی واضح ہو گئی تھی۔ اس احساس سے نجات پانے کے لئے میں بڑی بے باکی اور تیزی کے ساتھ گفتگو کرنے لگا۔ لیکن وہ شے بدستور بجتی رہی اور پھر ایک قطعیت اختیار کر گئی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ یہ میرے کان نہیں ہیں جو بج رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ میرا رنگ اور بھی پیلا پڑ گیا تھا لیکن میں بڑی صاف آواز میں بغیر کسی جھجک اور تامل کی باتیں کر رہا تھا۔ ادھر آواز تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی ——— اب میں کیا کروں ... ——— ؟ یہ آواز مدھم تھی اور بے کیف۔ لیکن تیز تیز تھی۔ یہ روئی میں ملفوف گھڑی کی آواز سے بڑی مشابہ تھی۔ میرا سانس رک رہا تھا ——— لیکن پولیس افسر پھر بھی اس آواز کو نہ سُن پائے ——— میں اور زیادہ جوش کے ساتھ جلدی جلدی باتیں کرنے لگا لیکن آواز تھی کہ دھیرے دھیرے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور قدرے بلند لہجے میں ہاتھ کے اشاروں سے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ آواز دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ یہ اور جاتے کیوں نہیں؟ میں بڑی تیزی کے ساتھ فرش پر ادھر اُدھر چلنے لگا ——— گویا ان آدمیوں کی تیز تیز نظروں نے مجھے برافروختہ کر دیا ہو۔ آواز بدستور بڑھ رہی تھی ——— یا خدا ——— اب میں کیا کروں؛ میرے منہ سے جھاگ اٹھ

ہا تھا۔ مَیں بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ——— میری آواز بڑی بلند ہوگئی؛ پھر مَیں کرسی پر بیٹھا ہوا جھومنے لگا۔ میں نے کرسی کو فرش پر ادھر اُدھر گھسیٹا لیکن آواز پھر بھی سُنائی دے رہی تھی۔ وہ بدستور بڑھتی ہی جارہی تھی ——— آواز اونچی، اور اُونچی ہوگئی۔ آدمی اب بھی بے فکری سے باتیں کررہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ انھیں یہ آواز سُنائی نہ پڑی ہو؟ کیا یہ ممکن ہے؟ اللہ نگہبان ہے ——— نہیں یہ نہیں۔ انھوں نے آواز سُن لی ہے ——— انہیں شک ہوگیا ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ مجھے خوف اور میری دہشت کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ یہی خیال تھا جو مجھے پریشان کررہا تھا۔ یہی تھا جو مَیں سوچ رہا تھا۔ یہ سب کچھ سوہانِ روح بنتا جارہا تھا۔ کیا اس تضحیک سے زیادہ کوئی اور ذلت بھی ہوسکتی ہے؟ یہ پرکار تبسم اب میری برداشت سے باہر ہوتے جارہے تھے۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ چیخ اُٹھوں۔ یا پھر ——— مرجاؤں ——— سُنو، غور سے سُنو، آواز، اونچی، اونچی اور اونچی ہوتی جارہی ہے۔

«بدمعاشو! ———» مَیں چیخ اُٹھا۔ «اپنی نیت پر پردے مت ڈالو»۔ جو کچھ مَیں نے کیا ہے، مَیں اس کا اقبال کرتا ہوں۔ تختے اُکھاڑو ——— یہاں ——— یہاں سے، یہاں سے ——— یہ اس کے ڈراؤنے دل کے دھڑکنے کی آواز ہے

ترجمہ: راج نرائن

تیرا گاؤں — میرا گھر

آج آدم پور واپس جاتے ہوئے پھر میری آنکھیں نم ہیں — مگر دل کا یہ گداز خوشی کے باعث ہے — چھ مہینے پہلے جب آدم پور سے میرا تبادلہ ہوا تھا اس وقت بھی میری آنکھیں نم تھیں — مگر تب آنکھوں میں جیسے ساون امڈ آیا تھا۔ غم کا ساون، اور گاؤں کے چودھری کی بیوی جو مجھے ماں کی طرح پیار کرتی ہے، مجھے گلے سے لپٹائے رو رو کر مجھے دلاسے دئے جا رہی تھی: "بیٹی مت رو، — یہ جدائی تھوڑے ہی دنوں کی ہے، ہم جلدی ہی کوئی ایسا بندوبست کریں گے کہ تو سدا کے لئے یہیں آ رہے"۔

آدم پور میں آٹھ دس مہینے کے قیام کے دوران میں، گاؤں کا گاؤں جیسے میرا اپنا ہی خاندان بن گیا تھا — ہر کوئی مجھے اپنا سمجھتا۔ حالانکہ وہاں پہنچنے سے پہلے میرا دل یہی سوچ سوچ کے پریشان تھا کہ جانے گاؤں کے لوگ کیسے ہوں گے؟ اجڈ، اَن پڑھ، گنوار ——— جانے وہ ایک شہری لڑکی سے کیسے پیش آئیں؟ میں وہاں کے اسکول کی استانی بن کر جا رہی تھی ——— جانے کیسے بچے ہوں گے ——— دیہاتی، پھوہڑ، بدتمیز!

لیکن وہاں پہنچکر مجھے سب سے پہلے جس بات سے اطمینان ہوا، وہ تھا میری رہائش کا انتظام گاؤں کے چودھری کی حویلی میں مجھے رہنے کو ایک کمرہ دیا گیا، جو نہایت صاف ستھرا تھا اور ضرورت کی سبھی چیزیں جس میں موجود تھیں۔ اگلے دن اسکول دیکھ کر میں قدرے اُداس ہو گئی۔ مٹی گارے کے دو کمروں پر مشتمل ایک ٹوٹا پھوٹا مکان، جہاں گاؤں کی نئی پود کو پروان چڑھنا تھا!

خیر، میں نے کام کاج سنبھالا — ایک دو دن کے بعد بچوں سے مطمئن ہو گئی — سب کے سب خوش طبع تھے اور جیسے میں کہتی ویسے ہی کرتے۔ یہ دیکھ کر میں نے اسکول کی شکل و صورت سنوارنے کا کام شروع کر دیا — اسکول کے وقت کے بعد بچوں کو لیکر میں نے دیواروں پر سفیدی کروائی — دیواروں کو نقشوں اور تصویروں سے سجایا …… باہر پھولوں کے پودے لگائے۔ اور کوئی دو مہینوں میں اسکول کی صورت ہی بدل گئی!

بچے جو پہلے گندے اور میلے کچیلے رہتے تھے، انہیں میں نے صفائی کی خوبیاں ذہن نشین کروائیں اچھی باتوں اور اچھی چیزوں سے ان کے دل میں ایک دلچسپی پیدا کی — ان کی عادتیں سنور گئیں، وہ صاف ستھرے رہنے لگے اور پڑھائی میں پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو گئے۔

اپنی محنتوں کو بارآور ہوتے دیکھ کر میں نے گاؤں والوں کو ایک نئے اسکول کی تجویز پیش کی جو جلد سے منظور ہو گئی اور یوں عورتوں کے لئے بھی ایک اسکول کھل گیا - وہاں میں گاؤں کی عورتوں کو کتابوں کی بجائے دلچسپ باتوں سے تعلیم دیتی - میں انہیں تاریخ، جغرافئے اور سائنس کی باتیں دلچسپ کہانیوں میں سناتی - انہیں اپنے وطن کی باتیں بتاتی اور غیر ملکوں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی - اور ان کے علاوہ سینے پرونے، کھانا پکانے کی باتیں ہوتیں، بچوں کی دیکھ بھال کا ذکر ہوتا....... غرضیکہ عورتوں کی دلچسپی اور فائدے کی سبھی باتوں کا خیال رکھا جاتا -

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جیسے ہر کسی کے گھر کا ایک فرد بن گئی - چودھری اور اس کی بیوی مجھے اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگے - ان کے اپنے کوئی بیٹی نہ تھی - بس ایک بیٹا تھا جو شہر میں کہیں پڑھتا تھا - اس لئے وہ اپنی اولاد کی ساری محبت مجھی پر نچھاور کرنے لگے -

گاؤں کا بنیا دیناناتھ بھی مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آنے لگا - اس کا کہنا تھا کہ میرے آنے سے اس کا کاروبار چمک اٹھا ہے - اب اس کی دوکان میں نئی نئی چیزیں آ براجی تھیں — اُون، رنگین دھاگے، بُننے کی سلائیاں، دیواریں سجانے کے رنگ برنگے کاغذ وغیرہ وغیرہ

اور عورتیں مجھ سے یوں بھی خوش تھیں کہ اب ان کے کھانوں اور پکوانوں میں ایک نیا ذائقہ آگیا تھا - میں نے انہیں کھانا پکانے کے نئے نئے طریقے بتائے - اب ان کا آئے دن کا کھانا بھی انہیں پہلے سے کہیں زیادہ مزا دیتا، کیونکہ میرے بتانے پر اب وہ سبھی کچھ 'ڈالڈا' میں پکاتی تھیں، جو کھانے کے اصلی مزے کو اجاگر کرتا ہے - پہلے وہ 'ڈالڈا' فقط تلنے کے لئے استعمال کرتی تھیں مگر جب میں نے انہیں بتایا کہ 'ڈالڈا' سبھی کھانوں کے لئے اعلیٰ ہے، تو انہوں نے اپنے سبھی کھانے 'ڈالڈا' ہی سے بنانے شروع کر دیئے -

اس گاؤں میں رہتے رہتے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہی میرا گھر ہے - جیسے میں یہیں پلی بڑھی ہوں — اور پھر میرا وہاں سے تبادلہ ہو گیا - رخصت کے وقت چودھری کی بیوی مجھ سے کیسے لپٹ لپٹ کے روئی اور کیسے کیسے دلاسے دیئے کہ ہم تجھے جلدی واپس بلا لینگے!

اور آج میں پھر آدم پور واپس جا رہی ہوں - چودھری کی بیوی جو مجھے ماں کی طرح چاہتی ہے اس نے مجھے واپس بلا لیا ہے - سدا کے لئے - استانی کے روپ میں نہیں، بلکہ اپنے گھر کی بہو بنا کر — اُن کا ایک بیٹا ہے نا .... جو اُن دنوں شہر میں کہیں پڑھتا تھا ....

اور میری آنکھیں نم ہیں، مگر دل کا یہ گداز ایک خوشی کے باعث ہے ....

معصوم رضا

قوسِ قزح

اس نے گنگناتے ہوئے ایک بار پھر رینو کا نام لیا اور ذہن کو خواب کی مدھم، خوشگوار اور لطیف پگڈنڈی پر سہارا دیکر
آیا۔ جہاں امنگوں اور آرزوؤں کی اَن گنت شمعیں فروزاں ہوتی ہیں۔ جہاں پر ہر چھوٹی چھوٹی امیدیں بے سہارا اور
بے خیالات کا دامن پکڑ کر سرور و کیف کی صہبا میں ڈھال دیتی ہیں۔ جہاں پر آکر زندگی قوسِ قزح کے مانند دمکنے لگتی ہے
ں کے ہر انگ سے سرشاری اور مستی کا رنگ چھلکتا ہے

اس کا ذہن بھی خواب کی ان ہی لطیف گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ خواب کی وہ لطافتیں جو صرف کھلی آنکھیں ہی
سوس کر سکتی ہیں۔ جن کی ہر تہہ میں کسی رجنی، ساجدہ اور کامنا کی حرارت سے زندگی کی رونق رہتی ہے اور جب اس میں
ظار کا بھی رنگ شامل ہو جاتا ہے تو خود قوسِ قزح بھی مدھم پڑنے لگتا ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کی
اری رنگینیاں اور رعنائیاں سمٹ کر انتظار میں سما گئی ہیں۔

وہ بھی انتظار کر رہا تھا مگر آج تو انتظار کی نوعیت ہی جدا تھی۔ اس کا کیف ہی الگ تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا اور خواب
بنتا رہا .... کچھ سوچتا رہا۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ پھر اب کیا سوچنے لگا ہے؟ اس کے دل میں اس قسم کے خیالات کیوں آنے لگے ہیں۔ آخر اس
زندگی میں انقلاب کیوں آنا چاہتا ہے؟ اس کی دنیا تو بس مانگنا اور وہ بھی بھیک مانگنا ہے۔ مگر وہ اسے کیا کرتا کہ آپ سے
پ اس کا ذہن اسی کو سوچنے لگتا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے یہ سب سوچنے کا حق نہیں ہے۔ ماضی میں دور تک اسے مایوسی کے
علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مایوسیاں اس کی زندگی میں کچھ اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ اب وہی اس کی
زندگی بن گئی تھی۔ بچپن کا وہ زمانہ جسے اس نے ماں کی گود میں گزارا تھا یقیناً کچھ آرام دہ گزارا ہوگا — مگر اب تو اسے وہ
بھی نہیں تھا۔ اسے جہاں سے یاد تھا وہ بھی بازاری فضا تھی جہاں وہ ایک میلا سا کچھ بچھائے چوراہے پر بیٹھا "بابو جی!
ایک پیسہ" کی رٹ لگاتا رہتا۔ اگرچہ اس کا دل بھی چاہتا کہ وہ اس "رٹ" کو پیچھے چھوڑ کر اپنے ہمسر لڑکوں کی طرح دوڑتا
ہوا نکل جائے۔ ان کے ساتھ ایک گلی سے دوسری گلی تک چھلانگ لگاتا رہے۔ وہ بھی کبڈی کا ویسے ہی شائق تھا۔ جیسے
دوسرے لڑکے ...... وہ بھی پتنگ اڑانا چاہتا تھا — مگر وہ تو مجبور تھا۔ اس کی کُل آرزوئیں اڑنے سے پہلے ہی گر جاتیں۔
اور وہ خود کو گھسیٹتا ہوا چوراہوں پر "بابو جی ایک پیسہ دیدو" کی گھسی ہوئی رٹ لگاتا رہتا۔

اور دونوں کے ساتھیوں میں اسے بس شانو یاد رہ گئی تھی۔ دونوں کی دوستی میں اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ
دونوں ہم سر اور ہم پیشہ تھے۔ شانو کو صبح سے شام تک اپنے بابا کا ہاتھ تھامے ایک بابو سے دوسرے اور دوسرے سے
تیسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا اور وہ بھی چوراہوں اور گلیوں میں مارا مارا پیسہ تلاش کرتا رہتا۔ اسے تو خبر اس کی شکل بھی

LIFEBUOY
SOAP

ظفر احمد

بے لائسنس کتّے

وہ قدم آگے نہیں بڑھا پا رہا تھا۔ جسم کا ہر عضو جیسے جواب دے چکا تھا۔ اُسے اپنا جسم بھاری اور بوجھل سا لگ رہا تھا۔ بے بارش میں بالو کا بورا ہو جاتا ہے۔ اب کہیں بیٹھ کر دم لئے بغیر چلا نہیں جاتا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ اس دفتر کے گیٹ سامنے ہی کھڑا رہا۔ پھر اُس کے سامنے والے فٹ پاتھ پر جا بیٹھا۔

رام کرشن کو محسوس ہوا کہ وہ ٹھیک طرح سے سوچ بھی نہیں پا رہا ہے۔ خیالات جیسے آپس میں اُلجھ رہے ہوں۔ وہ متعدد بار دفتر کی سیڑھیاں چڑھ اُتر چکا تھا۔ پھر بھی اُسے ایمپلائمنٹ ایکسچینج پر پورا بھروسہ ہے، چونکہ وہاں کے لوگ اچھے ہوتے ہیں۔ ادھر کے متعلق اُن کے دلوں میں ہمدردی ہے۔ یونیورسٹی کے سند یافتہ نوجوان کے اس طرح مارے مارے پھرنے سے کیسے تکلیف ہوگی؟ نوکری خالی کیوں نہیں ہے؟ کیوں سبھوں کے لئے نوکری نہیں ہے۔ اُس نے تھوڑی دیر سوچا۔ پھر اُسے احساس ہوا یسے اُلجھے ہوئے سوالات کو سلجھانے کی بیکار کوشش نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اُس نے سوچنا چھوڑ دیا۔ اُس کی خواہش ہوئی کہ خالی الذہن ہو کر یونہی سڑک کی جانب دیکھتا رہے مگر فائدہ کیا؟

"قلعی لگوانی ہے! برتنوں پر قلعی ......ی ......ی ......؟" پاس والی سڑک پر کوئی چیخ رہا تھا۔

"ہاں لگوانی ہے"! رام کرشن نے کہنا چاہا۔ مگر کس پر لگوانی ہے؟ گھر ہو تو گھریلو برتن بھی ہوں۔ دو مہینے سے تو وہ کسی کے مدرسے میں پڑا رہتا ہے۔

قلعی والے کی چیخ پھر فضا میں اُبھری۔ وہ رام کرشن کی طرف ہی آ رہا تھا۔ چلّانے والا سڑک پر اُترا۔ اُس کی ڈیڑھ ہی آنکھیں ہیں۔ ایک آنکھ جو پوری ہے وہ بھی داغدار ہے۔ پکی ہوئی داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہ بڑی تیزی سے چلا جا رہا تھا جیسے ساری دنیا پر قلعی لگا کر ہی دم لے گا۔ وہ رام کرشن کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک بار پھر اپنی بھونڈی آواز میں چیخ اُٹھا۔ "قلعی لگوانی ہے؟"...

"جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری قلعی ......" اُس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

سڑک پر انسانوں کا سیلاب موجیں مار رہا ہے۔ سبھی مصروف ہیں۔ ساری دنیا مصروف ہے۔ اتنے سارے لوگوں کو کام ہے، نوکری ہے صرف وہی بیکار ہے۔ ایک بڑھئی سوالیہ نشان کی طرح اپنے اوزار ہاتھ میں لئے بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکا بھی دوڑ رہا ہے۔ جیسے بڑی کشتی کے ساتھ ساتھ چھوٹی کشتی بندھی ہو۔ شاید وہ اس کا بیٹا ہے۔ ایک تانگہ والا بڑی شان سے تانگہ چلا رہا ہے۔ تولنے والی مشین کے ساتھ ایک لڑکے نے رام کرشن کے سامنے آ کر پوچھا

"وزن کراؤ گے بابو؟"

"نہیں۔"

"صرف ایک پیسہ۔"

"نہیں چاہیے، نہیں چاہیے"! اور اُس نے گھور کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ لڑکا منہ پچکا کر چلا گیا۔

نہیں ہو جائے گا۔"

اور پہلے رام کرشن کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ گھبرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اچانک کوئی اس طرح آکر چند لمحوں میں ہی اتنا بے تکلف ہو جائے وہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیونکر ممکن ہے۔ پھر بھی اُس نے ساتھ ہو لینا ہی مناسب سمجھا۔ چونکہ چائے پی لینے کے بعد ذرا سر چکرانا ٹھیک ہو جائے گا اور پھر بھوک بھی ذرا مٹ جائے گی۔

دونوں ایک سستے سے ہوٹل میں داخل ہو کر ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"دو اسٹرانگ ٹی .... اور تمہیں کچھ کھانے کے لئے؟"

"نہیں، کچھ نہیں چاہیئے۔"

"اسے تھوڑا کھاؤ .... بڑے ہے؟"

"ہاں بالکل گرم ہیں۔" بیرے نے جواب دیا۔

"تو پھر دو دو لے آؤ۔"

——— دونوں طشتریاں رام کرشن کے سامنے رکھی گئیں۔

"رہتے کہاں ہو؟"

"میں .... یہی .... رام کرشن ذرا ہچکچایا۔

"ویسے تو کہیں نہیں .... یہی بات ہے نہ؟"

"ہوں۔"

"خیر، اب جگہ کی کوئی فکر نہ کرو۔"

"مگر .... ؟"

"مگر کیا؟ کرائے کی بات؟"

"ہاں۔"

"کرایہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میرے ساتھ رہنا .... فری کوارٹر ہے .... ہاہاہا ...."

——— رام کرشن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"بے کار ہونا کوئی گناہ نہیں ہے۔ خیر ان سب کو چھوڑو، یہ بتاؤ گھر میں اور کون ہے؟"

"ویسے تو کوئی خاص رشتے دار نہیں .... ہاں صرف ایک بہن ہے۔"

"دیکھو! میرے لئے تو وہ بھی نہیں ہے۔ اچھا وہ کرتی کیا ہے؟"

"اپنے شوہر کے ساتھ ہے۔"

"بہت اچھا ہے۔"

اس وقت تک دونوں چائے پی چکے تھے۔ رام کرشن کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ ہوا کے ایک لطیف جھونکے نے اُسے تھپتھپایا اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی بھی کچھ اہمیت اور مطلب رکھتی ہے۔ دونوں سڑک کے کنارے کنارے چلنے

"مگر ...... [illegible] ......"

"میرے ساتھ چلو۔ آج سے ہم دونوں ساتھ ہی رہیں گے۔"

"مگر ......"

"مگر وگر کچھ نہیں۔ کسی بات کی فکر نہ کرو۔"

——— اوسیپ آگے آگے تھا۔ دونوں شہری سرحد پار کر کے دور جا رہے تھے۔ میونسپلٹی کی حدود سے بھی آگے بڑھ آئے۔ اب شہر کی رونق اور چہل پہل کم ہونے لگی تھی۔

"اور کتنی دور چلنا ہے؟" رام کرشن نے پوچھا۔

"بس اب آ گئے۔"

——— پھر ڈیڑھ فرلانگ اور آگے چل کر اوسیپ ایک پگڈنڈی پر اتر پڑا۔ سورج اپنی الوداعی کرنوں کے ساتھ پُراسرار غاروں میں روپوش ہو چکا تھا۔ رام کرشن ٹٹولتا ٹٹولتا اوسیپ کے پیچھے چل رہا تھا۔ ایک دو موڑ پار کرنے کے بعد دونوں ایک مکان کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ پہلے اوسیپ مکان کے اندر داخل ہوا اور پھر رام کرشن نے اس کی تقلید کی۔ اوسیپ راستے کے ساتھ ساتھ ضروری ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ "ادھر سے چلنا ...... پیر ذرا اوپر رکھنا ...... بائیں چلنا ...... وہ پتھر کے ٹکڑے ہیں ......" وغیرہ وغیرہ

اوسیپ نے موم بتی روشن کی۔ رام کرشن نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک عالیشان مکان کے ایک بڑے سے کمرے میں کھڑے

"یہ مکان؟" رام کرشن نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! یہی ہے۔"

"اپنا ہی؟"

"اپنا پرایا تو اُن لوگوں کے لئے ہوتا ہے جن لوگوں کے دلوں میں تیرے میرے کا خیال ہو۔ اپنے لئے تو سب ایک۔"

اتنا کہہ کر اوسیپ قہقہہ مار کر زور سے ہنس پڑا۔

"نہانا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر آؤ، سونے کی تیاری کریں۔"

——— اوسیپ رام کرشن کو دوسری منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں لکڑی کے مختلف ٹکڑے بکھرے ہوئے پھر اُس کمرے سے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں دو تین چٹائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اوسیپ لکڑی کے دو تین ٹکڑے لے آیا اور چٹائی نیچے رکھ دیئے ——— "یہ تکیئے کا کام دیں گے۔ اب ہم مزے سے سو سکتے ہیں"۔ اوسیپ بولا۔

رام کرشن نے قمیض اتار کر اوپر ٹانک دی۔ موم بتی گل کر دی گئی۔ کمرے میں کچھ نہ رہا۔

دور سڑک پر لاریوں سے لدی گاڑیوں کے چلنے کا شور کبھی کبھی سنائی دے جاتا تھا۔ رام کرشن کو ایسا محسوس ہوا، جیسے گاڑیاں اس کی چھاتی پر سے ہو کر گزر رہی ہیں اور چھاتی کے بل لیٹ گیا۔

"کیوں بھئی! نیند نہیں آتی؟ کچھ سوچ رہے ہو کیا؟" اوسیپ نے پوچھا۔

"نہیں تو ......"

"کیا تم کالج میں پڑھ چکے ہو؟
"ہاں"
"یہی تو غلطی کی"
"کیا کہا؟"
"کچھ نہیں ـ ——— دراصل پڑھے لکھوں کو اَن پڑھوں سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں"
"وہ کیسے"؟
"اس لئے کہ وہ ہمیشہ بیکار سوچا رہتا ہے اور اس دنیا میں زیادہ سوچنا اچھا نہیں۔ زیادہ سوچنے کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ یا تو ہم خودکشی کریں گے یا پھر فلسفی بن جائیں گے۔ اور میرے خیال میں یہ دونوں حرکتیں غلط ہیں۔ ہیں نا؟"
"..............."
"آخر تم سوچ کیا رہے ہو؟ گھر والے یاد آ رہے ہیں"؟
"نہیں"۔
"پھر اپنے متعلق"؟
"اوں .... ہوں ...."
"تو پھر کس کے متعلق"؟
"یہ مکان ———"؟ رام کرشن ذرا ہچکچایا۔
"یہ؟ کسی بھلے آدمی نے بنوایا ہوگا۔ اسے مکمل ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ مالک مکان کے یہاں کسی کی موت واقع ہو گئی اور سچ پوچھو تو یہ ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا۔ سارے بھئی! اس دنیا میں اپنی موت سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے لوگ بھی ہیں"
"وہ کیسے"؟
"اس کی موت کے باعث مکان کا کام بند ہو گیا ہے۔ جب تک کام پھر سے شروع نہیں ہوتا اُس وقت تک ہم آرام سے یہاں رہ سکتے ہیں"
"اُس کے بعد"؟
"اُس کے بعد.......... اُس کے بعد بھی کوئی نہ کوئی ایسا مکان بنوانے والا مل ہی جائے گا"
"مگر............"
"مگر کیا؟ اس مکان کے بننے کے قبل بھی میں اسی شہر میں تھا۔ اس وقت میں ایک تین منزلے مکان میں رہتا تھا۔ سچ کہتا ہوں بھائی! وہ اس سے کہیں بہتر تھا۔ نہانے کے لئے نہ صرف حمام تھا بلکہ اندر ہی سے پانی لینے کا انتظام اور کئی طرح کے شاور ٹیپ بھی تھے۔ ہاں تو کنواں باہر ہے۔ مگر کیا کیا جائے"
"پھر"؟
"پھر کیا کہوں بھائی! اُن کمبختوں نے اُس کا کام جلد ہی پورا کر دیا اور مجبوراً اُسے مجھے خیرباد کہنا پڑا۔ کچھ دنوں تک تو ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ پھر یہ مکان ڈھونڈ نکالا"
"اس کا مالک"

"جو دن دہاں سے رہنا چاہئے کسی کرنے ... [illegible] ... کس کے نام ہیں۔ ہم تو ......"

"اوں!" رام کرشن تھوڑی دیر خاموش رہا۔

"ارے بھئی! تم پھر سوچ میں پڑ گئے؟ اس کا کام پورا ہو جانے کے بعد بھی کوئی نہ کوئی مکان مل ہی جائے گا۔ گھبراؤ مت! اب بھی اُسی میں رہ سکتے ہیں مگر تھوڑی دُور اور جانا ہوگا۔"

"کیا اور کوئی مکان بنوا رہا ہے؟"

"ویسے تو مکان کا کام پورا ہو گیا ہے۔ سچ پوچھو تو کبھی تیار ہے مگر اس میں کوئی رہتا نہیں۔"

"کیوں"؟

"سُنو! مالک مکان کی لڑکی کو ایک ایسے لڑکے سے محبت ہو گئی جو شاعر تھا اور جو چار پیسے کمانے کی بجائے دن بھر بس شاعری کیا کرتا تھا۔ آخر لڑکی نے چمڑے کے کسی تاجر کے لڑکے سے شادی کر لی......"

"محبت کے باوجود دوسرے سے شادی کر لی؟" رام کرشن نے تعجب سے پوچھا۔

"بھئی! یہ سب چاہنے کی شدّت پر منحصر ہوتا ہے۔ جس میں چاہنے کی طاقت جتنی زیادہ ہوگی، وہ اتنی ہی محبت کر سکتا ہے اور جس میں کم ہے اُس میں محبت بھی کم ہوتی ہے۔ یہی میری رائے ہے۔ ہاں! میں کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکا شاعری کرنے والا کیا، شاعری کی گٹھڑی سر پر لادے پھرنے والا تھا۔ اکثر ایسے لوگوں میں دماغ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس لڑکی سے انتقام لینے کے لئے اُس نے اُس کے باپ کے بنوائے مکان میں خودکشی کر لی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اُس مکان میں اُس لڑکے کی رُوح بھٹکتی پھرتی ہے۔ بھلا تم ہی سوچو! اُس کی رُوح لڑکی کے پیچھے رہے گی یا اس مکان میں؟ لیکن سچ پوچھو تو یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ اب ہمیں اس میں بھی رہنے کا موقع ملے گا۔"

رام کرشن نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا۔ "کیا وہ لڑکی زندہ ہے؟"

"ہاں بھئی، زندہ ہے اور نہایت عیش و آرام کے ساتھ ہے۔"

"اوں ...." رام کرشن نے ایک لمبی سانس لے کر منہ بنایا۔

"کیا کل پرسوں تک تمہاری نوکری لگ جائے گی؟"

"کیا پتہ ....؟ ہاں! تم نے اپنا بزنس نہیں بتایا؟"

"ویسے تو کوئی خاص بزنس نہیں ہے۔ پرسوں آٹھ آنے ملے تھے اور کل بارہ آنے۔ آج بھی پروا نہیں۔ سوا روپیہ کما چکا ہوں۔"

"کس چیز کی تجارت کرتے ہو؟"

"نہیں بھئی! کتوں کو پکڑنا ہی میرا بزنس ہے۔"

"کیا کہا؟" رام کرشن نے حیرت سے پوچھا۔

"اس شہر میں بہت سے بے لائسنس کتے ہیں۔ انھیں پکڑ کر میونسپلٹی کو دینے سے پیسے ملتے ہیں۔ فی کتے کے لئے چار آنے مقرر ہیں۔"

"تو کیا .... یہی تمہارا بزنس ہے؟"

"ہاں!"

"کیا تمہیں ہمیشہ کتے ملتے رہیں گے؟"

"کتیاں ہمیشہ بچے نہیں جنیں گی؟ اور بھئی! میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا اچھا ہوتا اگر حکومت بے لائسنس آدمیوں کو پکڑنے کا

"بھی کوئی قانون بنا دیتی .... پھر کتنی آمدنی ہوتی .... ہوتی نا؟"

پہلے تو دونوں خوب ہنسے، پھر خاموش ہو گئے۔ شاید کچھ سوچ رہے تھے اور پھر سوچتے سوچتے سو گئے۔

دوسرے دن سویرے ہی سویرے اوسیپ نے رام کرشن کو جگا دیا۔ دونوں نہانے کے بعد اکٹھے ہی نکلا اور چائے بھی ساتھ ہی پی۔ اپنی ڈیوٹی پر جاتے ہوئے اوسیپ نے رام کرشن کے ہاتھ میں پانچ آنے تھماتے ہوئے کہا "دوپہر کو یاد کر کے کھانا کھا لینا۔ شام کو میں اُسی جگہ ملوں گا، جہاں کل ملاقات ہوئی تھی۔"

اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ اس بیچ مکان بھی تبدیل کرنا پڑا۔ دونوں اُس پربت والے مکان میں رہنے لگے۔ رام کرشن کا کام صرف آفسوں کی خاک چھاننا تھا ــــ وہ دن بھر مختلف دفتروں کی سیڑھیاں چڑھتا اُترتا رہتا مگر ہر جگہ اسے ایک ہی جواب ملتا "جگہ خالی نہیں ہے۔" اُس نے سوچا جنگ چھڑ جاتی تو کتنا اچھا ہوتا، نوکری تو ضرور ہی مل جاتی۔ اسے اس بات پر سخت افسوس ہوا کہ باتوں کی لڑائی چھوڑ کر یہ قومیں توپوں کی لڑائی کیوں نہیں لڑتی ہیں؟

"ان میں ہمت ہی نہیں ہے۔" اس نے نتیجہ نکالا۔

ہر شام جب اوسیپ واپس آتا تو اُس کے ساتھ دن بھر کے کارناموں کی سرگزشت بھی ہوتی۔ "بھئی! آج ایک کتا ملا، نہایت وحشی اور خوفناک، ساتھ ہی ہوشیار بھی۔ پہلے تو بہت چھٹپٹایا۔ مگر یہ اوسیپ بھلا اُسے چھوڑنے والا تھا؟ اگر چھوڑ دیتا تو یہ چار آنے کہاں سے آتے؟ آخر گلے میں پھندہ ڈال ہی دیا۔"

رام کرشن اوسیپ کی بہادری کے ان کارناموں کو بڑی دلچسپی سے سنتا۔ بیچ بیچ میں 'ہوں'، 'ہاں' بھی کرتا جاتا۔ آخر ایک دن پوچھ بیٹھا "اوسیپ! اس طرح کتنے دن چلیں گے؟"

"تم نے بائبل پڑھی ہے؟"

"بائبل؟"

"ہاں بھئی، بائبل۔"

"کیوں؟"

"خدا نے اُس میں کیا کہا ہے؟"

"بہت سی باتیں کہی ہیں۔"

"ہمارے متعلق کیا کہا ہے؟ یاد ہے؟ چڑیوں کو دیکھو! وہ نہ بیج بوتی ہیں ــــ نہ فصل کاٹتی ہیں ــــ نہ کھلیانوں میں غلہ جمع کرتی ہیں، پھر بھی زندہ رہتی ہیں۔ چونکہ اُن کی پرورش جنت کے باپ کرتے ہیں ــــ بائبل میں خدا نے یہی کہا ہے۔"

"چڑیوں کی بات ٹھیک ہو سکتی ہے مگر انسانوں کو کھانا ہو تو پھر بونا بھی پڑتا ہے۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو!"

"پتہ نہیں کیوں مجھے اُس پر یقین نہیں ہے۔"

"مجھے یقین ہے، میں زندہ رہوں گا۔"

"میری خواہش ہوتی ہے۔ گھر چلا جاؤں۔"

"ایسی باتیں کبھی نہ سوچنا۔ کتوں کو پکڑ کر بھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر کتے ختم ہو جائیں تو میں بھیڑیوں کو بھی پکڑنے سے باز نہیں آؤں گا ...... اگر ضرورت پڑی تو اس کو بھی توڑ دوں گا اور ہنڈل کر کے دکھاؤں گا۔ انسانوں کو بھی پکڑوں گا چونکہ مجھے زندہ رہنا ہے

ہم کیوں پیدا ہوئے ہیں، اس کے جاننے کی بجائے بہت سے تسلیوں کا کام ہے۔"
تھوڑی دیر تک رام کرشن خاموش رہا۔ پھر اس نے پوچھا "ہم کیوں زندہ رہتے ہیں؟ کم سے کم یہ تو جاننا چاہیئے"
"جب ہم پہلی جماعت میں پڑھتے تھے تو کیا میٹرک کی کتابیں سمجھ سکتے تھے؟ یہ سوچ کر اگر ہم اُس وقت خودکشی کر لیتے تو کیا ہوتا؟ سارا کھیل ختم ہونے کے بعد ہونی لازمی ہے۔ اسی میں عقل ہے۔"
"مگر اوسیپ! زندگی کے لئے کوئی سہارا ضرور ہونا چاہیئے!"
"ضرور چاہیئے، میں مانتا ہوں، مگر ہم سہارے کی تلاش سے پہلے ہی سہارا چاہتے ہیں، یہی پڑھے لکھوں کی غلطی ہے۔ صرف سوچیں گے ہو۔ آج کل زیادہ سوچنے کا مطلب ہے یا تو فلسفی ہو جانا یا خودکشی کر لینا!"
اسی طرح رام کرشن اوسیپ کے سہارے کسی طرح اپنی زندگی کی کشتی کھیتا رہا مگر مشکلات روز بروز بڑھتی ہی گئیں۔ ہر روز اوسیپ کو کتے نہیں ملتے۔ گندی اور غلیظ گلیوں کے نکڑ پر پھندہ لئے وہ کتوں کی تاک میں دن دن بھر بیٹھا رہتا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا اور آخر تھک ہار کر ناکام و نا امید گھر واپس چلا آتا یا کسی سستے سے ہوٹل میں ایک آنے کی چائے پی کر رستی گھماتا ہوا گھر واپس آتے ہوئے سوچتا "سمجھوں گا کہ آج چھٹی کا دن ہے، آخر ملازمت میں بھی تو کبھی کبھی تعطیل ہوا کرتی ہے"
مگر ان جھوٹی تسلیوں کا بھرم زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ مسلسل تین دنوں تک ایک بھی کتا نہیں ملا۔ ادھر اُدھر تاک میں وہ برابر رہا لیکن کہیں کتے کی بو تک نہیں ملی، جیسے کتے بھی اُسے سمجھ گئے ہوں۔ وہ نا امید ہو گیا۔ معاً اُسے ایک تدبیر سوجھی۔ وہ آگے لپکا اور اُس دن شام کو آٹھ آنے لیکر واپس لوٹا۔
مگر یہ نئی تدبیر بہت دنوں تک کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ چونکہ بات ذرا ٹیڑھی تھی۔ پالتو کتوں کو پکڑنا، لائسنس ہٹانا اور پھر اسے لوگوں کی نظروں سے بچا کر میونسپلٹی تک لے جانا آسان کام نہیں تھا۔ ایک دن وہ ایسا کر ہی رہا تھا۔ کہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

"ٹھہر جاؤ، بدمعاش!"
اوسیپ سہم کر کھڑا ہو گیا۔
"کتے کو کہاں لے جا رہے ہو؟"
"مگر لائسنس نہیں ہے۔"
"میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے، تم لائسنس نکال رہے تھے!"
"کون؟"
"تم!"

اب اوسیپ کے پاس کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔ وہ سڑک پر گھسیٹا گیا۔ بھیڑ لگ گئی۔ پولیس بھی بو سونگھتی ہوئی آ پہنچی لمحہ بھر بعد وہ پولیس اسٹیشن میں مقید تھا۔
آخر معاملہ عدالت میں گیا۔ مقدمہ کتے کو چرانے کے سلسلے میں تھا۔
وکیل نے پوچھا "کیا تم نے کتے کو چرایا تھا؟"
"جی ہاں!" اوسیپ نے اقرار کر لیا۔
اب تک شہر میں جتنی بھی چوریاں ہوئی تھیں اُن سب کا الزام اوسیپ کے سر منڈھ دیا گیا۔ پولیس کے ہاتھ میں پکے ثبوت تھے

وکیل نے جرح جاری رکھی۔ "تمہیں نے تاریل کی چوری کی تھی؟" ——— "جی ہاں!"

"اُن دو کرسیوں کی چوری بھی کیا تمہیں نے کی تھی؟" ——— "جی ہاں!"

"پانچ خطوط کے ساتھ اُس وینیٹی بیگ کو تمہیں نے چرایا تھا؟"

"وہ کیا چیز ہوتی ہے، وکیل صاحب!"

"عورتوں کے ہاتھ میں جو چھوٹی سی تھیلی رہتی ہے" ——— "جی ہاں! میں نے ہی......"

"خطوط کہاں ہیں؟" ——— "میں نے لے لئے"

"پھر کیا ہوا؟" "پھاڑ پھر کچھ نہیں!"

تماشائیوں کے بیچ سے کسی لڑکی کی سسکی اُبھری۔ "لفنگے نے جاونی کے تمام خطوط کا ستیاناس کر دیا"

کوئی لڑکی کو پکڑ کر باہر لے گیا۔

"کیا اُن خطوط کو تم نے پڑھا تھا؟"

"نہیں! مجھے انگریزی نہیں آتی"

"مگر وہ تو انگریزی میں نہیں تھے"

"ہو سکتا ہے"

وکیل ناراض ہو گیا اور بھی کئی سوالات کئے گئے۔ تمام کارروائیوں کے بعد اوسیپ نے کہا "عدالت سے میری ایک التجا ہے" ——— "کر سکتے ہو"!

"کم سے کم چھ مہینے تک یہ مقدمہ چلتا رہے"

"کیوں؟"

"تاکہ اس بیچ ہونے والی چوریوں کے لئے بھی کسی اور کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہو"

وکلا بھی زیرِ لب ہنسے۔ مگر اس سے اوسیپ پر توہینِ عدالت کا الزام لگایا گیا۔ اس کی سزا ہوئی۔ تیس روپے کا جرمانہ اگر جرمانہ ادا نہ کیا گیا تو ایک مہینے کی قید۔ بامشقت۔ اوسیپ نے قید کو ترجیح دی اور سوچا "یہی بہتر ہوگا"

رام کرشن نے سسکیاں بھریں۔ جب وہ عدالت سے باہر نکلا تو اُسے ساری دنیا ویران ویران، اُداس اُداس اور اجنبی اجنبی سی نظر آئی۔ سر لٹکائے وہ پیڑوں کے سائے میں تیز قدم بڑھاتا رہا۔ شہری حدود کو بھی پار کر کے وہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ مگر کہاں؟ یہ اُسے بھی معلوم نہ تھا۔ رات بھر وہ چلتا رہا۔ آخر تھک ہار کر ایک دوکان کے برآمدے میں اوندھے منہ لیٹ گیا اور مسلسل سسکیاں بھرتا رہا۔

ایک مہینہ بھی بہت جلد ہی بیت گیا۔ شہری زندگی کے ہنگامے میں تمام لوگ سب کچھ فراموش کر چکے تھے کہ اوسیپ پھر ان کے درمیان آگیا۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی، وہی پہلے جیسی زندہ دلی اور بےفکری تھی۔ ہاں جسم کچھ تندرست ہو گیا تھا۔ اوسیپ نے رام کرشن کو بہت تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ اُسے شک گزرا کہ کہیں کمبخت نے خودکشی نہ کر لی ہو۔ اسی وقت اُس کے ایک واقف کار ہوٹل والے نے کہا۔ "کیا تم بھی اُسی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہو؟"

"کس کے نقشِ قدم پر؟"

"اپنے دوست کے......! حضرت اب پاگل خانے میں ہیں"

"سچ؟"

"ہاں سچ!"

اوسیپ پریشان حال اُسی وقت پاگل خانے پہنچا۔ اُسے رام کرشن سے ملنے کی اجازت حاصل کرنے میں کافی دقتیں اُٹھانی پڑیں۔ رام کرشن وہاں بیٹھا بھگوان کی تعریف میں کوئی بھجن گا رہا تھا۔ گلے میں اُس نے سُرخ پھولوں کے ہار پہن رکھے تھے۔ اوسیپ کو دیکھتے ہی وہ سہم سا گیا۔

"کون؟ اوسیپ؟"

اس سوال سے اوسیپ کو کچھ تسکین سی ہوئی۔ چونکہ اُسے اس بات کی قطعی امید نہیں تھی کہ اب وہ اُسے پہچانے گا۔

"کب چھوٹ کر آئے یار؟"

"ایک ہفتہ ہو گیا۔"

"اب کہاں رہتے ہو؟ اُسی پریت والے مکان میں؟"

"ویسے تو کہیں نہیں۔"

"آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"کچھ طے نہیں کر سکا ہوں۔ مگر رام کرشن ...."

"پاگل ہُوں کیا؟ یہی پوچھنا چاہتے ہو نہ؟ ساری دنیا پاگل ہے۔ اس سچائی کو جان لینے کے بعد پاگل نہ ہونے کے لئے پاگل کا ڈھونگ رچانا ہی عقلمندی ہے۔"

"کیوں؟"

"یہاں اچھا راشن ملتا ہے، کافی آرام ہے ...."

"رام کرشن! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"حقیقی سکون کے لئے اس سے بہتر جگہ دنیا میں اور کوئی نہیں۔ یہاں امیر اور غریب کے درمیان کوئی مصنوعی دیوار نہیں، کوئی تمیز نہیں، کوئی فرق نہیں۔ یہاں سبھی ایک ہیں، ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ پیٹ بھر کھانا۔ اور کیا چاہیئے؟ لو ڈاکٹر آ رہا ہے اب مجھے ذرا اداکاری کرنی پڑے گی۔"

رام کرشن ناچنے گانے لگا۔ جب ڈاکٹر دوسرے راستے سے جانے لگا تو وہ خاموش ہو گیا۔

"یہ سب؟" اوسیپ نے پوچھا۔

"اچھی طرح دیکھ لو اور اگر پسند آ جائے تو آ جاؤ۔"

"نہیں! یہ اچھا نہیں ہے۔"

"باہر کیا سب کچھ اچھا ہے؟"

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد اوسیپ بولا "میں جا رہا ہُوں۔"

"اوسیپ!" رام کرشن کا گلا بھر آیا۔

"میں جا رہا ہُوں۔ کہیں نہ کہیں کوئی بے لائیسنس کُتا مل ہی جائے گا۔ میں اُسے پکڑ لوں گا اور زندہ رہوں گا۔"

اوسیپ آگے بڑھا۔ رام کرشن بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

(اُردو کی ایک عالم کہانی کا ترجمہ)

ملک میں ناپ تول کا ایک مشترک و سہل نظام رائج کرنے کے لئے ایک اور اہم قدم اٹھایا گیا ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ریاستوں اور مرکزی نظم ونسق کے علاقوں کے منتخبہ حصوں میں میٹرک باٹوں کے استعمال کی اجازت دی گئی تھی۔ اس برس ماہ اکتوبر سے ان علاقوں میں صرف میٹرک باٹ ہی قانونی باٹ تصور کئے جائیں گے۔

اپریل ۱۹۶۰ء سے جموں وکشمیر کو چھوڑ کر باقی سارے بھارت میں میٹرک باٹوں کے استعمال کی اجازت دے دی گئی ہے۔

اپریل ۱۹۶۲ء میں، دیش بھر میں میٹرک باٹوں کا استعمال لازمی ہو جائے گا۔

جاری کردہ بھارت سرکار

ادارہ
تبصرے

۱۔ اُردو اِملا

مصنف: غلام رسول۔ ناشر: ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد۔
صفحات ۵۶۔ قیمت ۸ آنے۔ کتابت و طباعت صاف ستھری

ادارۂ ادبیات اردو ہندوستان کے اُن چند علمی و ادبی اداروں میں سے ایک ہے جو خاموشی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اہم علمی موضوعات پر اچھی کتابیں چھاپ کر اردو کا سر بلند کرتے رہتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب جسے جناب غلام رسول سابق لائبریرین سٹی کالج حیدرآباد نے لکھا ہے، اسی ادارہ سے شائع ہوئی ہے اور نہایت اہم موضوع سے بحث کرتی ہے۔

مثال کے طور پر انگریزی ہی بار بار سامنے آتی ہے، آپ کوئی کتاب انگریزی کی اٹھا کر دیکھ لیجیے، کاما، فل اسٹاپ، کولن، سیمی کولن، ڈیش سب اپنی اپنی جگہ ملیں گے، املا میں کبھی فرق نہیں ہوگا یہ نہیں کہ ایک لفظ S سے لکھ دیا دوسری جگہ وہی لفظ C سے لکھا ہوا ملے۔ لارڈ میکالے نے ایک بار لکھا تھا کہ دس ہزار میں ایک لندن کا باشندہ بھی SHALL اور WILL کے محلِ استعمال کا تعین نہیں کر سکتا اس کے باوجود دس لاکھ میں ایک مشکل سے نکلے گا جو ان کا غلط استعمال کر جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی قواعد و املا کے ضابطے بنے ہوئے ہیں اور کوئی شخص ان سے تجاوز کی جرأت نہیں کرتا اپنی اپنی تجاویز سب پیش کرتے ہیں لیکن وہ بھی ہر حال میں لازماً قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ اردو کے لیے یہ بڑی شرمناک بات ہے کہ نہ اب تک اس کی تحریروں میں رموزِ اوقاف کا احترام ہے نہ املا میں صحت کو سختی سے مدِ نظر رکھا جاتا ہے نہ اس سلسلے میں کوئی تجویز سامنے آتی ہے اور آتی ہے تو اس پر سنجیدگی سے غور بھی نہیں کیا جاتا۔ جناب غلام رسول نے بہت ہی اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بعض مفید مشورے اور تجویزیں رکھی ہیں اگر انھیں (ضروری نہیں کہ سب کو) قبول کر لیا جائے تو نہ صرف اردو زبان کی تعلیم و تدریس میں آسانی ہو سکتی ہے بلکہ رسم الخط میں یکسانی اور یک رنگی بھی پیدا ہو گی۔

مصنف کی تمام تجویزوں سے اتفاق کرنا تو مشکل ہے اور اختلاف کے اسباب بھی قوی ہیں مثلاً انھوں نے ٹائپ کی دشواریوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر ان اعراب اور رموزِ اوقاف کی پابندی اس حد تک کی جائے تو ٹائپ کا "کی بورڈ" بہت دشوار ہو جائے گا اور کمپوزنگ کی مشکلیں بھی بہت بڑھ جائیں گی لیکن اس کا فائدہ مبتدیوں کو ضرور پہنچ سکتا ہے یا جو اجنبی حضرات صحیح تلفظ کے ساتھ اردو پڑھنا چاہتے ہوں اُن کے لیے بہت مفید ہے۔

۲۔ چراغِ منزل

مصنف: شاہد صدیقی۔ ناشر: انجمن ترقی اردو حیدرآباد (آندھرا)
قیمت دو روپے۔ صفحات ۹۶۔ کتابت و طباعت عمدہ۔

یہ شاہد صدیقی کا مجموعۂ کلام ہے۔ حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں شاہد کا نام کسی تعارف یا تعریف کا محتاج نہیں لیکن شمالی ہندوستان میں انھیں بہت کم لوگ اچھے غزل گو کی حیثیت سے جانتے ہوں گے۔ اس کے اسباب سے بحث تبصرے کے کالم میں نہیں کی جا سکتی۔ تقصیر دونوں ہی کی ہے۔ حیدرآباد کے اہلِ علم و قلم حضرات نے کبھی دکھنیت کے طلسمی حصار سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی اور ان کی بیشتر تحریریں "لوکل علیہ الرحمۃ" کی دائرہ کی ہو کر رہ گئیں اسی طرح شمالی ہند والوں نے حیدرآباد کے بڑے نامور

سے زیادہ اردو ادب میں کچھ جاننے اور ماننے کی رواداری کا ثبوت نہیں دیا۔ شاہد صدیقی رہنے والے اکبرآباد (آگرہ) کے ہیں لیکن ۱۹۳۲ء سے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ اور خاک دکن ایسی دامنگیر ہوئی ہے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس دور میں شاعروں کی تعداد اتنی وافر ہوگئی ہے کہ پوری فوج بھرتی کی جا سکتی ہے لیکن ان میں سنجیدہ شعر کہنے والے اور غزل کو اس کی آب و تاب اور شائستگی کے ساتھ نبھانے والے شاعروں کی فہرست بنائی جائے تو یہ تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ شاہد صدیقی یقیناً ان میں سے ایک ہیں۔ ان کی غزل میں احساس کا رچاؤ، تجربے کی پختگی، شعور کی تابندگی، کلام پر قدرت، اور وجدانی کیفیات کو الفاظ کے شیشے میں منقبض کر لینے کا ملکہ ملتا ہے۔ انھوں نے غزل کی آبرو بڑھائی ہے اور اسے زندگی کے سانچے میں ڈھالا ہے جو سرمستی، کیف و سرور اور فکر کی بالیدگی ان کی غزل میں محسوس ہوتی ہے وہ آج بہت کم شعرا کے کلام میں مل سکے گی۔ یہ مجموعہ ہمارے غزل کا قد بڑھاتا ہے اور ہر طرح قدر کے لائق ہے۔ چند اشعار انتخاب کیے جاتے ہیں جن سے شاہد کے رنگ سخن کا اندازہ ہو سکے ویسے یہ مجموعہ سراپا انتخاب ہے، ترک و اختیار کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔

کل ترے تصور نے محفلیں سجائی تھیں — آج دل کی دنیا میں تیری یاد تنہا ہے

راہ روکے ہوئے ہیں دشت و گلستاں کتنے — پھر بھی مجھ تک ترے دامن کی ہوا آتی ہے
آپ کے بعد بہاروں سے تسلی کیا ہو — آپ کی یاد بہاروں کو بھی تڑپاتی ہے
ان کو منظور نہیں درد کا رسوا ہونا — آہ کرتا ہوں تو آواز بدل جاتی ہے

ستم زدہ سہی ہے دنیا تمھارے جانے سے — کہیں تو کس نے کہیں ہم پہ کیا ستم گزرے

حیات کچھ بھی سہی کائنات کچھ بھی سہی — قیام جزو سفر ہے مقام نا معلوم

دو نہ صبح کا دھوکا لوگ خود سمجھتے ہیں — کس قدر اندھیرا تھا کس قدر اُجالا ہے

حریم عشق میں یہ ہے نظام خواب و بیداری — یہاں جب عقل سو جاتی ہے دل بیدار ہوتا ہے

فرق نور و ظلمت پہ جب نظر نہیں ہوتی — رات بیت جاتی ہے اور سحر نہیں ہوتی

چمن کے ایک ہی گوشے میں ہے ہجوم بہار — یہ وہ جگہ ہے جہاں میرا آشیانہ تھا

باغباں جب اپنا خون نذر لا نہیں سکتے — غنچے سوکھ جاتے ہیں مسکرا نہیں سکتے
ہم ہیں شائقِ نغمہ لاؤ ساز ہم کو دو — راگ چھیڑ بیٹھے ہو اور گا نہیں سکتے

ادبی اور تہذیبی رفتار کا آئینہ

ادبی دُنیا

ایڈیٹر
عابد رضا بیدار

جون ۱۹۶۰ء

ہندی کے لیے سرکاری ہدایت نامہ

پنڈت پنت نے سرکاری زبان کے بارے میں صدرِ جمہوریہ کے ہدایت نامے پر وزارت تعلیم اور وزارت قانون کے نمائندوں سے گفتگو کی۔ صدر نے وزارت تعلیم کو ہدایت دی ہے کہ ہندی کی سائنسی اصطلاحوں کو فروغ دیا جائے اور اس مقصد کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ اور وزارت قانون سے کہا گیا ہے کہ ماہران قانون کا ایک کمیشن قانونی اصطلاحات وضع کرنے اور انھیں رواج دینے کے لیے بنایا جائے۔

اس مباحثے میں وزیر تعلیم شری شریمالی اور نائب وزیر قانون شری ہجر نویس موجود تھے۔ اس سلسلے میں گفتگو کے لیے اور بھی جلسے ہوں گے۔

ہندوستان میں کتابوں کی اشاعت

اقوام متحدہ کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان دنیا کے اُن سات بڑے ممالک میں سے پانچواں نمبر ہے جو سب سے زیادہ کتابیں چھاپتے ہیں۔

۱۹۵۹ء کی رپورٹ میں ایک بک میں کہا گیا ہے کہ ان سات ملکوں میں پہلا نمبر روس کا، پانچواں ہندوستان کا، چھٹا نمبر امریکہ کا ساتواں فرانس کا ہے۔ ان ممالک نے ۱۹۵۸ء میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔

برطانیہ میں ایک ہزار انسانوں میں سے ۴۳۰ افراد روزانہ اخبار خریدتے ہیں۔ سویڈن میں ۴۹۲، فن لینڈ میں ۴۲۰ اور جاپان میں یہ تعداد ۴۰۰ ہے۔

فیچر فلموں کے بنانے میں ہندوستان کا دوسرا نمبر ہے جو سال گزشتہ میں ۲۹۵ فلمیں بنائیں۔ پہلا نمبر جاپان کا ہے جس نے ۳۹۰ فلمیں تیار کی تھیں۔ امریکہ میں صرف ۸۸ فلمیں بنائی گئیں۔

سنیما جانے والوں کی سب سے زیادہ تعداد روس کی ہے جہاں تین کروڑ دس لاکھ افراد پچھلے سال سنیما دیکھنے گئے۔ امریکہ میں دو کروڑ بیس لاکھ اور ہندوستان میں ایک کروڑ دس لاکھ انسانوں نے سنیما دیکھا۔

روس کے میوزیم کو تحفہ

لینن گراڈ کے "ہرمیٹیج میوزیم" کو ہندوستانی مصور نندلال بوس کی بنائی ہوئی ایک تصویر THE ROAD FROM MIAVATI" پیش کی گئی۔ یہ تصویر ہندوستان کے وزیر ثقافت جناب ہمایوں کبیر نے مسٹر میخائیلوف وزیر ثقافت روس کو اس وقت پیش کی جب وہ صدر روس کے ساتھ ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ اس تصویر کی اہمیت یہ بھی ہے کہ کلکتہ میوزیم کے سوا دنیا کے کسی میوزیم میں نندلال بوس کی بنائی ہوئی کوئی تصویر محفوظ نہیں ہے

ترجمان القرآن انگریزی میں

ہندوستان کی مرکزی حکومت نے مولانا آزاد کی کتاب ترجمان القرآن کا انگریزی ترجمہ شائع کرنے کے لیے تین ہزار روپے کی امداد دی ہے۔

فحش لٹریچر

حوض قاضی دہلی کے دو دکانداروں پر کورٹ نے پچاس پچاس

جرمانہ یا بصورت عدم ادائی ایک ماہ قید با مشقت کا حکم دیا ہے ان پر فحش لٹریچر رکھنے اور بیچنے کا الزام تھا۔ مقدمہ کا فیصلہ دہلی کے مجسٹریٹ مسٹر مہرہ وترہ کی عدالت سے ہوا۔

کتب فروشوں پر چھاپے

وزیر داخلہ پنڈت پنت نے راجیہ سبھا کو بتایا کہ دہلی کی پولس وقتاً فوقتاً کتاب فروشوں کے یہاں چھاپے مارکر فحش اور قابل اعتراض لٹریچر برآمد کرتی رہتی ہے، انھوں نے مسٹر پی۔ این راج بھوج کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ سال رواں میں ایسے دس افراد کو پکڑا گیا اور ان پر مقدمے چلائے گئے۔ سوال میں کہا گیا کیا یہ صحیح ہے کہ فحش لٹریچر عام طور سے اردو اور ہندی میں شائع ہوتا ہے؟ پنڈت پنت نے کہا کہ یہ بڑی حد تک درست ہے۔ انھوں نے راجیہ سبھا کو یقین دلایا کہ پولس اس معاملہ میں پوری طرح خبردار ہے لیکن بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے فوری اقدام میں دشواری پیش آتی ہے

یونسکو کا وظیفہ

یونسکو نے طباعت و اشاعت کے سامان پر تحقیق کے لیے ایک سکالرشپ دینا منظور کیا ہے۔ اس سے تحقیق کرنے والے کو ہندستان سے باہر بھیجا جائے گا۔ تحقیق کے موضوعات میں کتابوں کی طباعت عمومی اور خصوصی اشاعت، نشر و اشاعت کے قوانین اور ضابطے، ناشروں کی انجمن کی اہمیت، لاگت اور فروخت کے اعداد و شمار اور مصنفوں سے تعلقات نیز تقسیم کے ذرائع اور تشہیر کے وسائل وغیرہ شامل ہیں۔

غالب وظیفہ خوار ہو ....

مرکزی بورڈ آف ریونیو نے ادب، آرٹ اور صحافت کے ضمن میں وظیفہ یابوں کی تعداد ۵۹-۱۹۵۰ء میں ۹۱۰ بتائی ہے اُن کی آمدنی اس سال میں ۹۰ لاکھ ۴۹ ہزار ہوئی اور انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس جو ادا کیا گیا وہ ۴ لاکھ ۴۹ ہزار اور ۲ لاکھ ۱۸ ہزار بالترتیب ہے۔

شا کے مسودے

برٹش میوزیم نے برنارڈ شا کے مسودات خریدے ہیں جن میں اس کے ڈراموں کے اصلی مسودے بھی شامل ہیں جو شارٹ ہینڈ اور شکستہ میں لکھے ہوئے ہیں۔ نیشنل گیلری آف آئرلینڈ اور رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ کے ساتھ میوزیم میں شا کے اثاث البیت کی بعض اشیا بھی شامل ہیں۔

جرمنی میں تلاش حق

مشرقی جرمنی کے سرکاری اشاعتی ادارہ کوہیلر اینڈ امیلانگ سے گاندھی جی کی سوانح "تلاش حق" کا جرمنی ترجمہ شائع ہو رہا ہے جسے برلن کی ہمبولٹ یونی ورسٹی کے پروفیسر ہربرٹ میلزگ نے کیا ہے پروفیسر میلزگ نے کہا کہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے اسے ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء میں جب کہ گاندھی جی پونا جیل میں بند تھے اُن سے تحریری اجازت حاصل کرلی تھی۔

علی گڑھ میں جنرل ایجوکیشن کے نئے ڈائرکٹر

مئی کے پہلے ہفتے میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے جنرل ایجوکیشن کی نظامت کا چارج مشہور نثر نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی (سابق صدر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی) کو دے دیا ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین کا نیا عہدہ

ڈاکٹر سید عابد حسین جنرل ایجوکیشن کی ڈائرکٹرشپ سے سبکدوش ہوکر دہلی تشریف لے آئے ہیں اور اب وہ ریڈیو میں اردو پروگراموں کے ساہتیہ صلاح کار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

امتیاز علی عرشی کی علالت

اُردو کے مشہور محقق اور علوم مشرقی کے عالم مولانا امتیاز علی عرشی ناظم سرکاری کتب خانہ رامپور عرصے سے علیل ہیں۔ انھیں درد گردہ کی شکایت ہوئی تھی۔ معالجوں کے مشورے کے مطابق وہ آج کل پہاڑ پر مقیم ہیں۔

بلونت گارگی مدعی ...

اُردو اور پنجابی کے مشہور ادیب جناب بلونت گارگی نے پنجابی زبان کی ایک ناشر فرم پر مقدمہ دائر کردیا ہے۔ انھوں نے استغاثے میں کہا ہے کہ ان کی کتابیں مذکورہ ادارے نے غیر قانونی طور پر شائع کرلی ہیں۔ مقدمہ زیر سماعت ہے۔

ہفتہ وار سرکار

مدراس سے اردو کا ایک ہفت روزہ اخبار "سرکار" جاری

ہوا ہے۔ جس کی چیف اڈیٹر بیگم خورشید صاحبہ ہیں۔

غبار خاطر

مولانا آزاد کی شاہکار تخلیق غبار خاطر کا ہندی کا ترجمہ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی نے شائع کر دیا ہے۔

ہفتہ وار میزان کا اجرا

انجمن محبان اردو کانفرنس مدراس نے فیصلہ کیا ہے کہ افضل العلما ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی یاد میں ایک ہفتہ وار اخبار "میزان" جاری کیا جائے۔

شب قہقہہ

حیدر آباد (آندھرا) میں "شب قہقہہ" کے نام سے ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ایک درجن سے زیادہ مقامی اور بیرونی شاعروں نے شرکت کی۔

بسمل سعیدی کا مجموعہ کلام

اردو کے مشہور شاعر حضرت بسمل سعیدی ٹونکی کا تیسرا مجموعہ کلام شائع ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو مجموعے "کیف الم" اور "نشاط غم" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

نئی کتابیں

گزشتہ ماہ میں چھپنے والی قابل ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ رسالہ اردو ادب (سہ ماہی) علی گڑھ : آزاد نمبر
۲۔ گفتنی : مخمور سعیدی — مجموعہ کلام
۳۔ کفر و ایمان : ہری چند اختر — مجموعہ کلام
۴۔ حدیث خودی : جگر بریلوی — (خود نوشت سوانح عمری)
۵۔ دو جام : عبدالحمید عدم — ترجمہ رباعیات عمر خیام

مجلۂ علوم اسلامیہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اردو کا ایک ششماہی "مجلۂ علوم اسلامیہ" کے نام سے جاری کیا ہے جس کے اڈیٹر ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (صدر شعبۂ علوم اسلامی) مقرر ہوئے ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ جلد ہی شائع ہو کر آنے والا ہے۔

وفیات

بالکرشن شرما نوین

پچھلے ماہ ہندی کے مشہور شاعر اور ادیب، جنگ آزادی کے سپاہی اور پارلیمنٹ کے ممبر شری بالکرشن شرما "نوین" کا انتقال ہو گیا وہ کرائسٹ چرچ کالج کانپور کے گریجویٹ تھے اور تحریک ترک موالات کے زمانے میں سلسلہ تعلیم چھوڑ کر جنگ آزادی میں شریک ہو گئے تھے وہ گنیش شنکر ودیارتھی کے اخبار "پرتاپ" کے اڈیٹر بھی رہے اور کئی بار جیل یاترا بھی کی۔ آزادی کے بعد ان کی خدمات کے صلے میں انھیں راجیہ سبھا کی ممبری پیش کی گئی اور پدم شری کا خطاب بھی عطا ہوا۔ ان کی تصانیف میں "کم کم"، "کواسی" اور "اُرمیلا" بہت مشہور ہیں۔

مشتاق احمد زاہدی

مئی کے تیسرے ہفتے میں کراچی میں جناب مشتاق احمد زاہدی کا انتقال ہو گیا۔ وہ پرانے ادیب اور نثر نگار تھے۔ ان کے اکثر مضامین نیرنگ خیال، ساقی، عالمگیر وغیرہ میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

گاماں پہلوان

۲۳ مئی کو رستم زماں گاماں پہلوان کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ وہ ایک عرصہ سے قلب کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ گاما نے ایک زمانے میں ساری دنیا کو کشتی کے لیے چیلنج کیا تھا اور متفقہ طور پر وہ دنیا کا سب سے طاقتور انسان تسلیم کیا گیا تھا۔

ہمدرد دواخانہ کراچی کی ہمدرد اکادمی نے خواجہ محمد شفیع کی لکھی ہوئی کتاب "گاما" پچھلے سال شائع کی تھی۔

پنڈت گنگا وشنو پانڈے

جبل پور میں سنسکرت کے ایک مشہور عالم پنڈت گنگا وشنو پانڈے ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ سنسکرت کے متعدد مدرسوں اور اداروں سے وابستہ رہے تھے۔

دیویندر پرشاد سکسینہ بدایونی

اصغر گونڈوی کا ایک خط

بنام سوہن لال ایم اے کلکٹر المتخلص بہ شیفتہ

(جناب دیویندر پرشاد سکسینہ بدایوں کے نوجوان ادیب ہیں اور ادبی حلقوں میں تعارف کے محتاج نہیں انھوں نے اپنی لگن اور محنت سے اُردو کے قدیم تذکرے، دواوین اور خطوط کا بیش قیمت ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ پچھلے ماہ انھوں نے رتن ناتھ سرشار کی دو غیر مطبوعہ غزلیں پگڈنڈی میں اشاعت کے لیے بھیجی تھیں اس بار اصغر گونڈوی کا یہ اہم خط عنایت کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ادبی نوادر کے بادۂ کہن سے جرعات کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ——— (ادارہ)

گونڈہ

۸ رجنوری ۳۶ء

کرمی، تسلیم عرض ہے۔

میں علی گڈھ سے واپس آیا۔ کتابیں مطلق نہیں نکلیں اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ کتابیں بہت دیر میں طیار ہو سکیں۔ دوسری بات یہی تھی کہ اس ہنگامۂ عام میں کتاب کی خرید و فروخت کا جہاں تک تعلق ہے اس کی ایک عام شکایت ہے۔ ہاں اتنا ہو گیا کہ وہاں پہنچکر میں ایک حد تک طیار کر لی گئی ہے وہ یہ کہ امید ہے کہ کتاب پر ریویو بہت اعلیٰ سے اعلیٰ اخبار و رسالے میں نکل جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز فرمیں خدا جانے کس طرح تقریباً۔۔ کتابیں غائب ہو گئیں۔ ایک ہم عصر الم بستیہ صاحب نے البتہ اتنا کیا ہے کہ ڈیڑھ سو جلدیں لی ہیں جن کی قیمت ہفتہ عشرہ میں کہا ہے کہ مجھے بھجوا دیں گے۔ تقریباً ساڑھے چار سو روپیہ کے پیٹے میں پڑ گیا ہوں اور یہ کل کا کل رہن کے روپے ہیں۔ مگر خدا سے امید ہے کہ یہ دن بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جائیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس دیوان پر ایک مفصل اور بسیط ریویو انگریزی میں لکھ کر کسی انگریزی رسالہ میں دیجئے۔ اس کی بابل نقل نہ ہو گا۔ اس کی انتہائی ضرورت ہے۔ یہ کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ کوئی ایک بحث لے کر ایک نمبر لکھ کے چھپوا دیا۔ اس کے دوسری بحث اٹھائیے۔ میرے اشعار میں آپ کو مختلف حیثیتیں ایسی مل جائیں گی آپ چاہیں تو عرصہ تک اس کا سلسلہ قائم رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے متعلق ہر جگہ یہ اشارہ کرتے رہیں کہ یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ احسان صاحب کا مقدمہ تو کچھ نہیں ہے مگر اقبال سہیل کا تبصرہ بجائے خود ایک بے نظیر شے ہے۔ اس سے آپ کو مدد ملے گی بلکہ کہیں کہیں سے اگر اسی کا ترجمہ انگریزی میں کر کے دیدیجئے تو وہ بھی ایک خاص چیز ہو گا۔

اب وہاں کے مشاعرے کے متعلق سُنئے کہ دو تمغۂ طلائی (ایک تو اسٹوڈنٹ یا علی گڈھ کے لئے اور ایک باہر والوں کے لئے تجویز ہوئے ۵ رجنوری کے "ہمدم" میں اعلان ہوا ہے کہ باہر والوں میں سے بہترین غزل نیاز مند کی تجویز کی گئی ہے اور وہ تمغہ مجھ کو ملے گا۔

ہوا ہے۔ جس کی چیف ایڈیٹر بیگم خورشید صاحبہ ہیں۔

غبارِ خاطر

مولانا آزاد کی شاہکار تخلیق غبارِ خاطر کا ہندی ترجمہ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی نے شائع کر دیا ہے۔

ہفتہ وار میزان کا اجرا

انجمن محبانِ اردو کانفرنس مدراس نے فیصلہ کیا ہے کہ افضل العلما ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی یاد میں ایک ہفتہ وار اخبار "میزان" جاری کیا جائے۔

شبِ قہقہہ

حیدرآباد (آندھرا) میں "شبِ قہقہہ" کے نام سے ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ایک درجن سے زیادہ مقامی اور بیرونی شاعروں نے شرکت کی۔

بسمل سعیدی کا مجموعۂ کلام

اردو کے مشہور شاعر حضرت بسمل سعیدی ٹونکی کا تیسرا مجموعۂ کلام شائع ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو مجموعے "کیفِ الم" اور "نشاطِ غم" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

نئی کتابیں

گزشتہ ماہ میں چھپنے والی قابلِ ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں:-

۱۔ رسالہ اردو ادب (سہ ماہی) علی گڑھ :		آزاد نمبر
۲۔ گفتنی :	مخمور سعیدی	مجموعۂ کلام
۳۔ کفر و ایمان :	ہری چند اختر	مجموعۂ کلام
۴۔ حدیثِ خودی :	جگر بریلوی	(خود نوشت سوانح عمری)
۵۔ دو جام :	عبدالحمید عدم	ترجمہ رباعیاتِ عمر خیام

مجلۂ علوم اسلامیہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اردو کا ایک شش ماہی "مجلۂ علوم اسلامیہ" کے نام سے جاری کیا ہے جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد آرزو (ریڈر شعبۂ علوم اسلامی) مقرر ہوئے ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ جلد ہی شائع ہو کر آنے والا ہے۔

وفیات

بال کرشن شرما نوین

پچھلے ماہ ہندی کے مشہور شاعر اور ادیب، جنگِ آزادی کے سپاہی اور پارلیمنٹ کے ممبر شری بالکرشن شرما "نوین" کا انتقال ہو گیا وہ کرائسٹ چرچ کالج کانپور کے گریجویٹ تھے اور تحریک ترکِ موالات کے زمانے میں سلسلۂ تعلیم چھوڑ کر جنگِ آزادی میں شریک ہو گئے تھے وہ گنیش شنکر ودیارتھی کے اخبار "پرتاپ" کے ایڈیٹر بھی رہے اور کئی بار جیل یاترا بھی کی۔ آزادی کے بعد ان کی خدمات کے صلے میں انھیں راجیہ سبھا کی ممبری پیش کی گئی اور پدم شری کا خطاب بھی عطا ہوا۔ ان کی تصانیف میں کُم کُم، کواسی اور ارمیلا بہت مشہور ہیں۔

مشتاق احمد زاہدی

مئی کے تیسرے ہفتے میں کراچی میں جناب مشتاق احمد زاہدی کا انتقال ہو گیا۔ وہ پرانے ادیب اور نثر نگار تھے۔ ان کے اکثر مضامین نیرنگِ خیال، ساقی، عالمگیر وغیرہ میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

گاماں پہلوان

۲۳ مئی کو رستمِ زماں گاماں پہلوان کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ وہ ایک عرصہ سے قلب کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ گاما نے ایک زمانے میں ساری دنیا کو کشتی کے لیے چیلنج کیا تھا اور متفقہ طور پر وہ دنیا کا سب سے طاقتور انسان تسلیم کیا گیا تھا۔

ہمدرد دواخانہ کراچی کی ہمدرد اکادمی نے خواجہ محمد شفیع کی لکھی ہوئی کتاب "گاما" پچھلے سال شائع کی تھی۔

پنڈت گنگا وشنو پانڈے

جبل پور میں سنسکرت کے ایک مشہور عالم پنڈت گنگا وشنو پانڈے ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ سنسکرت کے متعدد مدرسوں اور اداروں سے وابستہ رہے تھے۔

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

اصغر گونڈوی کا ایک خط

بنام سوہن لال ایم اے کلکٹر المتخلص بہ شیفتہ

(جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایوں کے نوجوان ادیب ہیں اور ادبی حلقوں میں تعارف کے محتاج نہیں انھوں نے اپنی لگن اور محنت سے اُردو کے قدیم تذکروں، دواوین اور خطوط کا بیش قیمت ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ پچھلے ماہ انھوں نے رتن ناتھ سرشار کی دو غیر مطبوعہ غزلیں پگڈنڈی میں اشاعت کے لیے بھیجی تھیں اس بار اصغر گونڈوی کا یہ اہم خط عنایت کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ادبی نوادر کے بادۂ کہن سے جرعات کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ـــــــــــــــ ادارہ)

گونڈہ

۸ر جنوری ۳۶ء

مکرمی، تسلیم عرض ہے۔

میں علی گڈھ سے واپس آیا۔ کتابیں مطلق نہیں نکلیں۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ کتابیں بہت دیر میں طیار ہو سکیں۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ اس ہنگامۂ عام میں کتاب کی خرید و فروخت کا جہاں تک تعلق ہے اس کی ایک عام شکایت ہے۔ ہاں اتنا ہو گیا کہ وہاں پہنچ کر میں ایک حد تک طیار کر لی گئی ہے وہ یہ کہ امید ہے کہ کتاب پر ریویو مبہت اعلیٰ سے اعلیٰ اخبار و رسالے میں نکل جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز سفر میں خدا جانے کس طرح تقریباً . . کتابیں غائب ہو گئیں۔ ایں ہم بر سر علم۔ منیجر صاحب نے البتہ اتنا کیا ہے کہ ڈیڑھ سو جلدیں لیلیٰ میں چمن کی قیمت ہفتہ عشرہ میں کہا ہے کہ مجھے بھجوا دیں گے۔ تقریباً ساڑھے چار سو روپیہ کے بیٹھے میں پڑ گیا ہوں اور یہ کل کا کل قرض کے روپے ہیں۔ مگر خدا سے امید ہے کہ یہ دن بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جائیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس دیوان پر ایک مفصل اور بسیط ریویو انگریزی میں لکھ کر کسی انگریزی اخبار۔ رسالہ میں دیجئے۔ اس نیز یا بل داخل نہ ہو گا۔ اس کی انتہائی ضرورت ہے۔ یہ کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ کوئی ایک بحث لے کر ایک نمبر لکھ کے طبع کرا دیا۔ اس کے بعد دوسری بحث اٹھائیے۔ میرے اشعار میں آپ کو مختلف حیثیتیں ایسی مل جائیں گی آپ چاہیں تو عرصہ تک اس کا سلسلہ قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے متعلق ہر جگہ یہ اشارہ کرتے رہیں کہ یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ احسان صاحب کا مقدمہ تو کچھ نہیں ہے مگر اقبال سہیل کا تبصرہ بجائے خود ایک بے نظیر شے ہے۔ اس سے آپ کو اتنی مدد ملے گی بلکہ کہیں کہیں سے اگر اسی کا ترجمہ انگریزی میں کر کے دے دیجئے تو وہ بھی ایک خاص چیز ہو گا۔

اب وہاں کے مشاعرے کے متعلق سُنیے کہ دو تمغہ طلائی (ایک تو مسٹوڈنٹ علی گڈھ کے لئے اور ایک باہر والوں کے لئے تجویز ہوئے ہے۔ ۵ر جنوری کے "ہمدم" میں اعلان ہوا ہے کہ باہر والوں میں سے بہترین غزل نیاز مند کی تجویز کی گئی ہے اور وہ تمغہ مجھ کو ملے گا۔

آپ خوش ہونے کے ساتھ ہی بہت ہی بے چین ہوں گے کہ وہ غزل دیکھیں۔ غزل علیگڑھ میگزین میں نکلے گی مگر مجھے آپ شوق و بے چینی کا کافی احترام ہے اس لئے پشت پر غزل لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ مشاعرہ میں یاس و سیماب وغیرہ سب تھے تو اقبال کا انتظار رہا مگر افسوس کہ وہ نہ تھے۔ سہیل میں میرا ایک خاص مضمون قابل ملاحظہ ہے۔

احقر اصغر

پشت پر غزل ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ذرا تکلیف جنبش دے نگاہِ برق ساماں کو ۔۔۔ جہاں میں منتشر کر دے مذاقِ سوزِ پنہاں کو

یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراق رنگیں ہیں ۔۔۔ مگر اک مشت پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو

تمنا ہے نکل کر سامنے بھی عشوہ فرما ہو ۔۔۔ کوئی دیتا ہے جنبش پردۂ بے تابیٔ جاں کو

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا ۔۔۔ کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

دکھائی صورتِ گل پر بہارِ شوخیٔ پنہاں ۔۔۔ چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

میر کی آپ بیتی

(خدائے سخن میر تقی میر کے اپنے قلم سے)

میر کا مرتبہ اردو غزل میں مسلم ہے۔ اس کی شاعری اپنے معاشرے کی تصویر اور ایک زوال آمادہ تاریخی دور کی صدائے بازگشت ہے اس لیے میر کی شاعری کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کو غور و فکر سے پڑھنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ اور یہ اہم ضرورت میر نے خود اپنے حالات لکھ کر پوری کر دی ہے اصل کتاب فارسی میں تھی۔

"اب جناب نثار احمد فاروقی نے اس کا اردو میں نہایت شگفتہ و رواں ترجمہ تشریحی نوٹوں اور توضیحی حاشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے جس سے کتاب کا افادہ اور بڑھ گیا ہے۔" (معارف)

اور یہ کتاب بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی:

"اردو کے ستھرے، پاکیزہ، شریفانہ ادبیات میں ایک معقول اضافہ ہے۔" (صدق جدید)

سرورق: اندر جیبت۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ

قیمت ڈھائی روپے

مکتبہ برھان، اردو بازار جامع مسجد، دہلی ۶

یا

ادارہ ادبستان اردو، ہال بازار، امرتسر
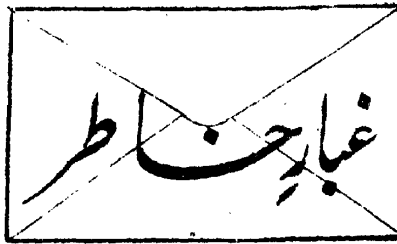
جگر بریلوی

ضعف نے تو اس قابل نہیں رکھا کہ بقدرِ شوق کسی ادبی چیز کا مطالعہ کر سکوں، پھر بھی پگڈنڈی کے اداریے ضرور پڑھتا ہوں اول سے شروع سے آخر تک۔ آپ جو لکھتے ہیں، معلومات پر مبنی لکھتے ہیں۔ صاف صاف لکھتے ہیں۔ بڑے سلیقے اور جرأت سے لکھتے ہیں۔ آپ کے اندازِ تحریر سے بہت ہی خوش ہوتا ہے۔

آپ نے مولانا صلاح الدین احمد کی تقریر پر جو تبصرہ کیا ہے، حرف بحرف صحیح ہے۔ اسی طرح آل انڈیا ریڈیو کے ساہتیہ سمارو کی تنقید کرکے حق گوئی کا حق آپ نے ادا کر دیا۔ "ڈاکٹر محمد حسن کا انشائیہ اسنا بے روح اور غیر دلچسپ تھا کہ کم سے کم انشائیے کے نمونے کے طور پر اسے پیش کرنا تو کھلی ہوئی زیادتی ہے" خیال ہے کہ یہ ڈاکٹر اردو ادب کے ہیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی شان میں ایسے جملے کہہ دینا جو آپ نے کہہ دیئے، غیر معمولی جرأت ہی کا ثبوت نہیں دینا بلکہ یہ بھی اس سے مترشح ہے کہ کہنے والا اسے ثابت بھی کر سکتا ہے۔ یہ وہ کارِ آپ کی آواز میں اثر پیدا کرے۔ اگر پگڈنڈی جیسے ایک دو اردو کے جریدے حق گوئی کے میدان میں اور اتر آئیں تو غلط بخشیوں کے طوفان بدتمیزی کا کہیں تو خاتمہ ہو!

مئی کے رسالے میں فیض احمد صاحب فیض دو جگہ رونق افروز ہیں غزل میں بھی اور قطعوں میں بھی۔ معاف کیجئے نہ غزل غزل ہے نہ قطعے قطعے۔ غزل میں چھ شعر ہیں اور کئی "المعنی فی بطن الشاعر" کا حکم رکھتے ہیں۔ قطعے بھی اس سے کچھ زیادہ مستثنیٰ نہیں۔ غزل کے مطلع میں جو "رہگزار" فرمایا گیا ہے تو "رہگزار" کس زبان کا لغت ہے۔ یہ تو ان سے دریافت کیجئے۔ بات یہ ہے کہ جہاں کسی شاعر کے متعلق ڈھنڈورا پیٹا گیا اس کا دماغ پھر جاتا ہے۔ وہ اپنے ہذیان کو بھی الہام اور خرافات کو آیات سمجھنے لگتا ہے۔ فیض صاحب اسی مرض میں گرفتار ہیں۔ مگر آپ کو تو خدا نے پہچاننے اور پرکھنے والی نظر دی ہے۔ آپ ڈھنڈورے سے کیوں مرعوب ہوں۔

محمد طفیل (مدیر نقوش)

"..... آپ کا پرچہ پگڈنڈی پڑھتا ہوں لطف اندوز ہوتا ہوں۔ مگر اداریے میں بڑی تلخی آ رہی ہے۔ اس میں تھوڑی سی بہت شکر گھول لیجئے کڑواہٹ بیاری تو دور کر دے گی مگر منہ کا مزا خراب رہے گا.... "

سعادت نظیر (حیدرآباد)

.... خوشی ہوئی کہ ماہنامہ پگڈنڈی حسین سے حسین تر ہو رہا ہے۔ حسنِ ترتیب کے ساتھ کتابت بھی اچھے سلیقے کی مظہر ہے۔ صوری محاسن ہی قابلِ داد نہیں بلکہ معنوی جمال بھی خوب تر ہے خصوصاً گزشتہ ماہ کا اداریہ تو دل کی آواز معلوم ہوا۔ البتہ غزلوں اور نظموں کے انتخاب میں کچھ اور احتیاط برتی جائے...

صفدر آہ (بمبئی)

فردوسیِ ہند پر آپ کے گراں قدر تبصرے کے لیے آپ کا بدل ممنون ہوں۔ فارغ کو فردوسیِ ہند میں نے نہیں بنایا خود اپنے عہد میں وہ فردوسیِ ہند کہلائے جاتے تھے۔ ان کی تاریخ ارتحال جو میری ولادت سے مدتوں قبل کہی گئی ہے یہ ہے۔ رفت فردوسی دوراں آہ آہ (صفحہ ۳۰ فردوسیِ ہند) مجھ پر غلو کا الزام ثابت نہیں ہے۔ اگر آپ میرے غلو کی طرف اشارہ کرتے تو میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتا۔ فارغ کی فردوسیت کی توضیح میں میں کافی لکھ چکا

ہوں۔ جو ان کے کلام کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو ان کا مطالعہ کرتے ہی سب سے پہلے سامنے آجاتی ہے۔ ہندوستان کا کوئی فردوسی سے اتنا قریب نہیں۔

مرثیے، مرثیے کے فن اور مرثیے کی روایات کے متعلق اردو ادب میں بہت کم معلومات آسکی ہے (حالانکہ حقیقت یہ ہے صنف مرثیہ مخزار دہ ہے) شاید یہی وجہ ہے کہ اچھے خاصے بلند پایہ ادیب مرثیے کی روح اور مزاج کا تمسک نہیں کرسکتے۔ وہ تو میر سودا مرثیہ گو اور انیس و مرثیہ گویان خانوادۂ انیس کو ایک ہی سمجھتے تھے۔

محمود زکی (اجین)

بمبئی میں مئی ۱۹۶۰ء کا شمارہ نظر نواز ہوا تو اس کی مقصدیت، معیار کی بلندی اور پاکیزگی دل و دماغ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا خاص طور پر "جان سخن" کا دوسرا حصہ آپ کی صحت مند اور بے لاگ پالیسی کا صحیح ترجمان محسوس ہوا۔

حقیقتاً آل انڈیا ریڈیو پہ ادب نوازی کا جو بھوت سوار ہے اسے آئینہ دکھانا ضروری تھا۔ آپ نے اس تقاضے کو بھیانک اور بھرپور انداز میں پورا کیا ہے۔ ریڈیو اور تخلیقی ادب کا کوئی میل ہے بھی نہیں۔ ارباب ریڈیو کو اپنے پسندیدہ ادب کی سرپرستی تک ہی قناعت کرنا چاہیے۔ ان کی مصلحت اندیشانہ روش نہ فن کاروں کا صحیح انتخاب کرسکتی ہے نہ ادب کی تخلیقی قوتوں کو سمجھ سکے گی۔

یہاں جب بھوپال اور اندور ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہوا تو اس موقع پر وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر کیسکر نے رسم کے مطابق تقریر بھی فرمائی جس میں بہت سی یقین دہانیوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس نشرگاہ کے قیام کا مقصد یہ بھی ہے کہ یہاں کے فن کاروں کو ابھرنے کے خاطر خواہ مواقع بہم پہنچائے جاسکیں اور علاقائی ادب ترقی کرتا رہے۔ لیکن اس کے بعد عملی طور پر خوشامد پسندوں کے علاوہ کسی کو بھی نہیں پوچھا گیا۔ میں نے بزم ادب اجین کے اجلاس عام میں ایک تجویز پاس کرائی اور شکایت ڈاکٹر کیسکر کی افتتاحی تقریر کے حوالے کے ساتھ ارسال کی تو بزم ادب کے صدر گویا قریشی صاحب کو مدعو کیا گیا (گویا صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں، اساتذہ میں شمار ہے) کہ وہ عید الضحیٰ کی خصوصی تقریب میں عید الضحیٰ پر تقریر کریں۔ واہ رے اس انتخاب کی! وہ تو یوں کہیے اردو کا فن کار کچھ ہوتا بھی "ہر فن مولا" قسم کا ہے گویا صاحب نے یہ بھی کر دکھایا۔ بس پھر سناٹا رہا۔ عرصۂ دراز کے بعد پھر دوبارہ شامل کی گئی تو بزم ادب کے نائب صدر حضرت قریشی کو ایک مشاعرے میں شریک کر لیا گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ یہ تھی اجین کی نمائندگی۔

ریڈیو کے ادب نوازوں کے لیے وہی "اے واے اگر معرض اظہار میں آوے" والی بات پر اکتفا بہتر ہے۔ آپ نے حقیقت کا جرأت مندانہ اظہار واقعی خلوص کے ساتھ فرمایا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے انشائیہ کا ذکر آتا ہی کیوں۔ آپ کے اسی خلوص نے جان سخن کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ حقیقتاً جان سخن ہر لحاظ سے لائق ستائش ہے۔

نظیر احمد صدیقی (حیدرآباد)

... مئی کا شمارہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اب اس کا معیار برابر بلند ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً آپ نے جان سخن کے ذریعے پرچے میں جان ڈال دی ہے۔ اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے اردو رسائل میں کوئی ایسا نہیں جو اتنی بے خوفی اور بے باکی سے تنقید کرسکے۔ اس کے لیے آپ نے جتنے خطرات مول لیے ہوں گے اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جرأت مندی اور حوصلہ اردو میں عام ہونا چاہیے اب وہ زمانہ نہیں رہا جب صرف تعریف اور مدح کو تنقید سمجھ لیا جاتا تھا۔ امید ہے کہ آپ اسی طرح اپنی آواز بلند کرتے رہیں گے کبھی کبھی ایسی تنقید کا لہجہ [illegible] ہو جاتا ہے۔ داغ نے کہا ہے۔

وہ رسوائی سے ڈر جائے تو اچھا
نمایاں کام کر جائے تو اچھا

Only Title & Advertisements Printed at Pioneer Press, Hall Bazar, Amritsar.